میں ساز ڈھونڈتی رہی
ادا جعفری

میں ساز ڈھونڈتی رہی

ادا جعفری (بدایونی)

غالب پبلشرز

فہرس

انتساب

دیباچہ ۷

پیش لفظ ۲۵

احساسِ اوّلیں ۲۹

محبّت ۳۱

یہ آنسو!؟ ۳۴

ان کی شکایتوں کا..... ۳۶

عیدِ نظّارہ ۳۸

غزل ۴۲

جوہی کی کلیاں ۴۳

بہار کا پہلا پھول ۴۶

...تقریب تیرے یاد آنے کی ۴۸

جھیل ۵۱

صبحِ بنارس ۵۴

ناآراستہ حُسن ۵۹

ایک تصویر دیکھ کر ۶۱

پروین کے نام ۶۹

بہار کا راگ ۷۱

تجدید ۷۲

اشعار ۷۵

یادِ ماضی ۷۶

التفاتِ گریزاں ۷۹

نئی موجِ طوفاں	۸۱
غزل	۸۴
خیر مقدم	۸۶
تعمیرِ نو	۹۱
کم یاب نگاہیں	۹۳
نقش بر آب	۹۴
بیزاری	۹۷
یہ مرے دل کو۔ ۔ ۔	۱۰۰
لرزاں سائے	۱۰۳
شکستِ ساز	۱۰۸
پیمانِ وفا	۱۱۰
اعتذار	۱۱۳
تنہائی	۱۱۵
یہ جیون یونہی بیتے گا	۱۱۷
پرچھائیاں	۱۱۹
افق کے پار	۱۲۱
غزل	۱۲۴
میرے محبوب۔ ۔ ۔ ۔	۱۲۵
غزل	۱۲۸
قافلے	۱۳۰
اک ذرا صبر۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۱۳۴
شکریہ	۱۳۶
غزل	۱۳۸
مَیں ساز ڈھونڈتی رہی	۱۴۰
غزل	۱۴۴
سہارا	۱۴۵
غزل	۱۴۸
نقرئی دھندلکے	۱۵۰
دو نین کمل	۱۵۲
شگوفے	۱۵۵
غزل	۱۵۷
غزل	۱۶۰

جمال بھائی کے نام

انیسویں صدی کا نصف آخر علم و ادب اور فنون کی ترقیوں کا ایک ایسا دَور تھا جب مغربی دنیا سارے عالم کے فوز و فلاح کی گویا اجارہ دار بن چکی تھی۔ وہ وقت جاگیرداری اور سامراجی نظام کا نصف النہار تھا لیکن خود مغربی مفکرین کے حلقوں میں کچھ اصحابِ فکر و نظر ایسے بھی تھے جو تہذیب و تمدن کی اس تعمیر کو استوار نہ سمجھتے تھے اور افق پر آنے والی آندھی کا غبار انہیں صاف نظر آرہا تھا۔ اس وقت انگریز ادیب اور شاعر اور مفکر میتھیو آرنلڈ نے لکھا تھا:

"ہم لوگ دو دنیاؤں کے درمیان کھڑے ہیں۔ ایک تو مر چکی اور دوسری میں ابھی اتنی قوت نہیں کہ بیدار ہو سکے۔"

کوئی شاعر اور مفکر ہی گزرتی ہوئی دنیا اور آنے والی دنیا کے امکانات کے متعلق اس قدر صحیح پیش قیاسی کر سکتا ہے لیکن میتھیو آرنلڈ کی نظر میں جو دنیا مر چکی تھی

وہ اپنے کفن میں بھی اپنے کو سب سے زیادہ زندہ سمجھ رہی تھی! البتہ شاعر ایک دوسری دُنیا کا انتظار کر رہا تھا جس میں ابھی قوّتِ تو پیدا ہوئی تھی۔

کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا جب میتھیو آرنلڈ نے آنے والی دنیا کا ذکر کیا تھا لیکن آج اس کا وہ تصوّر ایک انقلابی اور متحرک زندگی کے قالب میں سما کر سامنے آچکا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے تصور کی وہ دنیا جس میں نصف صدی پہلے پیدا ہونے کی قوت نہ تھی آج پیدا ہو چکی ہے اب ہم دو دُنیاؤں کے درمیان کھڑے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ ایک ایسی نئی دنیا کی ہیجانی کیفیت سے اپنا حصّہ پا رہے ہیں جو ہر قدم پر قدیم تہذیب و تمدن کے غرور سے انتقام لے رہی ہے۔

یہ تصور بھی غلط ہے کہ کوئی شاعر اپنے وقت سے پہلے یا بعد پیدا ہو سکتا ہے۔ حسن کار ادیب اور شاعر اپنے وقت اور زمانہ کی اولاد ہوتا ہے اگر وہ اپنے آرٹ میں اپنے وقت کے صحیح نقش و نگار پیش نہ کر سکے تو وہ فن کار یا حسن کار تو ہو سکتا ہے مگر ترجمانِ حقیقت نہیں ہو سکتا ___ ہندوستان اپنے اس انقلابی دَور میں ایسے ادیب اور حسن کار پیدا کر رہا ہے جو اپنے قلوب سے نئی دنیا کے صحیح عکس کو اپنی شاعری اور اپنے ادب میں منتقل کر سکتے ہیں۔ ہمارے ملک کا ادب بیسویں صدی کے آغاز تک بھی اس سرمایہ داری اور جاگیرداری اور ساہوکاری کے قدیم دور کی گود میں پرورش پاتا رہا جو مخصوص طبقات کی بالادستی کا دور تھا لیکن جب خود مغربی دنیا میں ساہوکار اور جاگیردار اور کلیسائی اقتدار کے اجارہ دار

اپنے سماجی نظام کے خلاف شاعری اور ادب کی بغاوت کو دبا نہ سکے تو اس بغاوت کا اثر ایشیا کے ممالک پر بھی پڑنا شروع ہُوا۔ اس دورِ جدید میں ایشیائی ادب جس قدر روسی انقلاب سے متاثر ہوا کسی دوسری تحریک سے متاثر نہ ہو سکا۔ روسی افکار کے انقلاب میں ایک ناقابلِ انکار قوت تھی۔ جس نے کم و بیش تمام ایشیائی ممالک میں (جو جاگیرداری نظمِ زندگی کی زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے) انقلابی افکار کی تخم ریزی کی اور محض تفریحی اور فراری ادب اور اس کی وجدانی نزاکتوں اور فنی باریکیوں کے بجائے ایک ایسے عوامی ادب کی تعمیر شروع کی جس نے عوام کی نبضِ حیات سے اپنا ایک گہرا ربط قائم کیا۔

ہندوستان میں جس طرح کم و بیش تمام دنیا کے ممالک میں عورت تہذیب و تمدن کے ترکہ سے ہمیشہ محروم رکھی گئی — سماج کے لیے قانون سازی کا حق مردوں نے صرف اپنے لیے مخصوص رکھا تھا۔ اس لیے عورت نے ہمیشہ ایک ایسے ماحول میں تربیت پائی کہ اس کے اندر زندگی کے بہت سے حقوق سے اپنی محرومی کا احساس بھی نہ پیدا ہو سکا۔ وہ سماج کے ایک آہنی پنجرے میں بند رکھی گئی اور مرد نے اسے نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی اعتبار سے بھی صنفِ ضعیف قرار دیا۔ ہندوستان کی طرح ان ممالک میں جو بیسویں صدی کے انقلاب کے دھارے سے دور تھے عورتوں کے اس جبریہ تعطّل کی تاریکی میں روشنی کی شعاعیں بہت دیر میں پہنچیں لیکن بالآخر وہ دن آیا جب ہم عمومی ادب میں چند ایسی خواتین کا نام بھی دیکھنے لگے جن کے شاعرانہ افکار کو انقلابی افکار نے مس کیا تھا۔ ہمارے ملک میں ابھی ایسی

خواتین کی تعداد بہت کم ہے لیکن "صنفِ ضعیف" کے حلقوں میں بھی اب چند چنگاریاں چمک رہی ہیں اور چند شمعیں روشن ہوگئی ہیں ـــــ خونِ جگر کے چند قطرے گرنے لگے ہیں جن سے بہت سے نئے چراغ روشن ہونے والے ہیں قدیم سماج کے اجارہ داروں کے خلاف بغاوت کا وہ بیباک جذبہ بیدار ہو چکا ہے جو شعر و ادب کی دنیا میں مردوں کی قدیم جاگیرداری کو تسلیم نہیں کرتا اور حالی کی زبان سے (جو جدید ادب کے پہلے معمار تھے) صاف کہتا ہے:

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

اس مسئلہ کی حد تک شاعرِ مشرق اقبال بھی میتھیو آرنلڈ کی طرح دُو دنیاؤں کے درمیان کھڑا تھا۔ وہ کبھی تو کہتا تھا:

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہبان ہے فقط مرد

کبھی سوال کرتا تھا:

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ!
آزادیٔ نسواں کہ زمرّد کا گلوبند

اور پھر خود اپنے عجز کا اعتراف کرتا تھا کہ

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا

مجھے یقین ہے کہ اگر آج اقبال زندہ ہوتے تو انہیں اس بحث کا فیصلہ کرنا ہی پڑتا اور تسلیم کرنا پڑتا کہ اب ہندی عورت کی نظر میں زمرد کا گلوبند

آزادیٔ نسواں کا نعم البدل نہیں ہے۔ وہ "زمرد کے گلوبند" والے طبقے کے طبقاتی تفوق کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہے اور عمومیت اور انسانیت کی آزادی میں آزادیٔ نسواں کی طلبگار ہے!

ادب اور شعر کے میدان میں جو عمومیت کے جذبات کا ایک بہت وسیع میدان ہے — ابھی تک ہندوستان کی خواتین کے صرف چند ہی نام نمایاں ہیں مثلاً حیا لکھنوی، نوشابہ قدوائی، صفیہ شمیم، ذکیہ سلطانہ، اداؔ بدایونی اور شاید چند اور۔ ان میں بھی دو تین ہی ایسی خواتین ہیں جنہوں نے اپنے ادب میں ترقی پسند رجحانات کو پوری طرح ظاہر کیا ہے۔ جدید ادب اور شعر کے معماروں کی صفِ اوّل میں محترمہ اداؔ بدایونی کا نام اور کلام نمایاں ہے۔ ایک مختصر پیش لفظ میں ان کے کلام کی تمام خصوصیات پر تبصرہ کرنا ممکن نہیں لیکن جہاں تک جدید ادب سے اداؔ بدایونی کے افکار کا ربط قائم ہے مجھے کچھ کہنا چاہیے۔

یہ واقعہ کہ جدید ادب کے تقاضوں نے ہمارے ملک کی خواتین کو اپنی طرف رجوع کر لیا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ دور کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے قدامت اور جمود کے خلاف عوامی افکار نے جو راستہ اختیار کیا ہے اس کے صحیح ہونے کا ثبوت اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خواتین عموماً ہر قوم میں سب سے زیادہ قدامت پسند ہُوا کرتی ہیں اب زمانہ کے تقاضوں سے متاثر ہو رہی ہیں اور ان کا ادب اور ان کی شاعری عمومی افکار کی آئینہ دار

بننے پر آمادہ ہوگئی ہے"۔ اداؔ بدایونی، جیسی خواتین کا یہ رجحان جدید ادب کا ایک نشانِ راہ ہے جس سے ہم اس منزل کا پتہ پاتے ہیں جہاں ملک کے ذہنی انقلاب کی تمام قوتیں مجتمع ہو رہی ہیں۔ اس طرح ہماری ملّت کی عورتیں علاّمہ اقبال کے اس بیان کی تردید کرنا چاہتی ہیں کہ

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

وہ بہت جلد اس حقیقت کو بے نقاب کر دینا چاہتی ہیں کہ اب کچھ زیادہ عرصہ تک عورت کے جوہر کی نمود غیر کے اختیار میں نہ رہے گی بلکہ وہ اپنی صنف کے متعلق شاعرِ مشرق کے اس دعویٰ کی دلیل بنا چاہتی ہے کہ اس کے شعلے سے جس طرح شرارِ افلاطوں ٹوٹا تھا اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں۔ (اقبال) اس طرح اور بہت سے شرار اور شعلے بھی ہیں جن کا ہندوستان کے نئے دور کی نئی عورت مقابلہ کرنے والی ہے۔

آج جدید ترکیہ کے قومی شاعر "ضیا" کے وہ الفاظ ہمارے خلوت خانوں میں بھی ایک لرزشِ حیات پیدا کر رہے ہیں۔ شاعرِ اعظم ضیا نے کہا تھا کہ

"جب تک عورت کی صحیح اور مکمل حیثیت نہ پہچانی جائے گی۔ قومی زندگی نامکمّل رہے گی۔ میں نہیں جانتا کہ ہم نے عورت کو پسِ پشت کیوں ڈال رکھا ہے . . . تو پھر کیا اس کو اپنی سوئی نیزہ میں تبدیل کر دینی چاہیئے تاکہ وہ تم سے زبردستی اپنے حقوق حاصل کر لے"۔

ترکوں کے تجدد کی آواز ہم تک بہت دیر سے پہنچی مگر بالآخر آب پہنچ رہی ہے اور ملک کی متعدد زبانوں میں ہندوستانی خواتین ادب اور شاعری کے ذریعے مطالبہ حقوق انسانیت کا راستہ صاف کر رہی ہیں — وہ سب کچھ لے کر رہیں گی جو ان کا حصّہ ہے! مجھ جیسے بوڑھے شاید ہندوستان کی نسوانیت کے اس شاندار عہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں لیکن ان ہی عورتوں کی گودوں میں وہ بچے پرورش پائیں گے جو اس عہدِ جدید کا خیر مقدم کریں گے۔

اداؔ بدایونی کے کلام میں ان کانٹوں کی نوک صاف نظر آ رہی ہے جو دلوں میں کھٹک رہے ہیں۔ انہوں نے جو جدید ادب کی نمائندگی کی ہے میں اس اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے عام طور پر ان کی فکرِ سخن اور اندازِ بیان کے بعض گوشوں کی سرراہ چند اشارے کرتا ہوں۔

فنّی نقطۂ نظر سے جو زیادہ تر قدیم نقطۂ نظر ہے" ادا" کی شاعری میں اقبالؔ جگرؔ اور فانیؔ کے اسلوبِ بیان اور طرزِ فکر کے علاوہ منظر نگاری اور ترنم کا ایک پہلو کافی نمایاں ہے۔ ترنم کا تو صرف ایک ہی نمونہ کافی ہے۔

ڈھلکے ڈھلکے آنسو ڈھلکے

چھلکے چھلکے ساغر چھلکے

دل کے تقاضے ان کے اشارے

بوجھل بوجھل ہلکے ہلکے

دیکھو دیکھو دامن اُلجھا
پھیڑو پھیڑو ساغر چھلکے
ان کی تمنا ان کی محبت
دیکھو سنبھل کے دیکھو سنبھل کے
کتنے ٹیڑھے کتنے سیدھے
رستے ان کے رنگ محل کے

اقبال کے اثرات کے ہلکے ہلکے نقوش ان اوراق کے بعض مقامات پر بہت پُر کیف ہیں :۔

کم یاب ہیں لیکن وہ جہاں سوز نگاہیں
بڑھ کر جو کمند انجم و خورشید پہ ڈالیں

تری نگاہ سے روشن رہیں دلوں کے شرار
سرودِ نے پہ نہیں نغمۂ حرم کا مدار
مجھے نگاہِ خرد آشنا سے شکوہ ہے
کہ ہو سکی نہ شعورِ نگاہ سے دوچار

جگرؔ کے تغزّل کا رنگ بھی کہیں کہیں اس طرح جھلکتا ہے :۔

سامنے بے نقاب بیٹھے ہیں — وقعتِ حسن دمہر و ماہ گئی
اس نے نظریں اٹھا کے دیکھ لیا — عشق کی جرأتِ نگاہ گئی

یا پھر اِدھر اُدھر چند جواہر پارے فانی کی طرزِ بیان یاد دلاتے ہیں مناظر نگاری کا رنگ ان سب سے جدا ہے، لیکن مناظر نگاری میں بھی کہیں کہیں لہجہ بہت غمگین ہے۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ شاعر کو مایوس تو کبھی نہ ہونا چاہیے، مگر غمگین ہونا چاہیے۔ اس کے ساز کے نازک تار ٹوٹ جاتے ہیں قہقہوں کی ضرب سے!۔۔۔صرف ہلکا تبسم ہی انہیں گوارا ہے۔" ادا" کی مناظر نگاری کے چند نمونے میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے۔ طرب و نہار کی وارداتوں میں بھی حزن کی پرچھائیاں موجود ہیں۔ مثلاً" بہار کا پھول" ۔

ہے زیبِ شاخِ حسن گلستاں کہیں جسے
اک پھول جانِ کیف بہاراں کہیں جسے
ابرِ کرم کا قطرۂ اوّل گہر بکف
افسانۂ بہار کا عنواں کہیں جسے
یا جستجوئے جلوۂ رنگینِ دوست میں
وہ چشمِ انتظار کہ حیراں کہیں جسے
یا اوّلین سرشکِ محبت سرِ مژہ
محرومیٔ نشاط کا پیماں کہیں جسے

"ایک تصویر دیکھ کر" " ادا" کو شاعرِ مغرور کا ایک سجدۂ بیتاب یاد آتا ہے:

جو آستانِ ناز پر اس نے لٹایا تھا کبھی
اک شعر دل کے ساز پر بھولے سے گایا تھا کبھی

اس طرح "ادا" کی نظم میں شاعر کے رنگین خواب کی یہ تعبیر ہے۔ اس طرح "جوہی کی کلیاں" "جھیل" "صبحِ بنارس" "بہار کا راگ" اور ایسی متعدد نظموں میں "ادا" نے اپنے ساز کے اس تار کو انگلی لگائی ہے جس سے ایک غمگین نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ بہت مدھم ۔!

"یادِ ماضی" کے عنوان سے فرماتی ہیں :۔

ہاں ابرِ سیہ! انجمِ رخشندہ پہ چھا جا
آنکھوں تلے پھرنے لگے ماضی کے نظارے
تاروں کی طرح میرے تصوّر میں ہیں روشن
وہ لمحے جو فردوسِ محبت میں گزارے
کیا بھول گئے ہیں وہ محبّت کی کہانی
کیا یاد انہیں اب نہیں جمنا کے کنارے
میرے مہِ تاباں سے ادا کون یہ پوچھے
تنہا کوئی کب تک شبِ مہتاب گزارے

ایک چیز اور بھی "ادا" کے کلام میں کہیں کہیں نظر آتی ہے وہ طنز کی ہلکی سی چاشنی ہے۔ مثلاً عنوان ہے کہ

"ان کی شکایتوں کا لکھا میں نے یہ جواب":۔

تم تو وفا شناس و محبت نواز ہو
ہاں ہیں خطا شعار سہی بے وفا سہی

میں محفلِ نشاط میں نغمہ طرازِ شوق
تم زیرِ لب تبسّمِ حسرت نما سہی
تم کو خیالِ غم سببِ اضطرابِ دل
مجھ کو بیانِ درد مسرت فزا سہی
مَیں اشتیاقِ دید و مروّت سے بے نیاز
اور تم نگارخانۂ مہر و وفا سہی
ہے اک وفا شناس کو پاسِ وفا ادا
ورنہ کہاں ہم اور کہاں بخششِ خطا!!

"ادا" کی شاعری کے عام انداز پر سرِ راہ ایک نظر ڈالنے کے بعد اب میں جدید ادب سے ان کے کلام کے ارتباط کا جائزہ لینا چاہتا ہوں میری نظر میں ان کے کلام کا یہی پہلو سب سے زیادہ اہم ہے۔ میں جدید ادب کو فن کے قدیم پیمانوں میں سختی کے ساتھ جانچنے کا قائل نہیں۔ جدید ادب عوام کے لیے نئی زندگی کا ایک پیغام لایا ہے لہٰذا اس کے جانچنے کا سب سے زیادہ معتبر پیمانہ اس کی "اثریت" ہے۔ اگر مَیں دیکھوں کہ کسی شاعر نے عوامی زندگی کی نبض پر انگلی رکھی ہے اور اس نے اپنے کلام میں وہ اثر پیدا کیے ہیں جس سے عوام کے قلوب میں گرمی اور ذوقِ عمل پیدا ہو سکتا ہو تو مَیں قطع نظر تمام دوسرے مضمرات کے اس کو بلا تکلف "داستانِ فن" کی صنف سے بھی کہیں آگے بٹھا دوں گا۔

"ادا بدایونی" کے کلام میں جہاں کہیں یاس اور مایوسی کا کوئی پہلو نظر آتا ہے

تو اس کے دوش بدوش ہم امید اور ایک بے محابہ جذبہ کارفرما دیکھتے ہیں جو شاعرہ کے کلام کی تکمیل کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں وہ قدیم طرزِ فکر پر تنقید کرتی ہیں مثلاً

نقش برآب ہے وابستگیٔ حسن و شباب
نکہتِ گل کی طرح عشق ہے پابندِ ہوا

تو اس کے ساتھ یہ کہہ کر اپنے سننے والے کا خیال بدل دیتی ہیں:۔

منزلیں اور بھی کتنی ہیں محبت کے سوا
روحِ آزاد گرفتارِ سلاسل کیوں ہو

ایک مقام پر زندگی کے قدیم اسلوب سے بیزار ہو کر فرماتی ہیں:۔

سوچتی ہوں کہ کوئی حجلۂ تاریک ہے کیا
یہ گرانبار تسلسل
یہ حیاتِ جامد
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کوئی روزن بھی نہیں کوئی دریچہ بھی نہیں
ایک دنیا ہے کہ ہے تیرہ و محدود و اداس
نور و نکہت سے گریزاں مہ و انجم سے نفور
جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال
کاش پڑ جائے کہیں ایک خراش ایک شگاف
غم کے ہاتھوں ہی سہی

اور بھولے سے کبھی

کوئی آوارہ سی چنچل سی کرن آ نکلے

ایک لمحہ کے لیے

میرے تاریک گھروندے میں اجالا ہو جائے

پھر ایک نظم میں اس بیزاری کو یوں ظاہر کرتی ہیں :-

میں نے گلریز بہاروں کی تمنا کی تھی

مجھے افسردہ خیالوں کے سوا کچھ نہ ملا

چند سہمے ہوئے سایوں کے سوا کچھ نہ ملا

جگمگاتے ہوئے تاروں کی تمنا کی تھی

میں نے موہوم امیدوں کی پناہیں ڈھونڈیں

شدّتِ یاس میں مبہم سا اشارا نہ ملا

ڈگمگاتے ہوئے قدموں کا سہارا نہ ملا

ہائے کس دشتِ بلاخیز میں راہیں ڈھونڈیں

یاس اور بیزاری کے پہلو میں بھی ایک جذبۂ طلب ہے۔ بغاوت کی شورش ہے جس سے ایک پیغامِ عمل پیدا ہوتا ہے :-

زد پہ آندھی کے دیا کانپ رہا ہو جیسے

تھک کر افسردہ و ویران گزرگاہوں میں

آخری عہدِ وفا ہانپ رہا ہو جیسے

اور یہ آنسو ہے کہ آنکھوں سے ڈھلکتا ہی نہیں

ہائے یہ ساغرِ لبریز چھلکتا ہی نہیں

اپنے ملک کی عمومی زندگی کو آندھیوں کی زد پر رکھ کر دیکھ لیجیے اور تصور کیجیے شاعرہ کے مجروح احساسات کے اس پس منظر کا جہاں وہ اپنے ساغرِ لبریز کو چھلکانے کے لیے بیتاب ہے۔

کوئی تعمیر بغیر تخریب کے ممکن نہیں۔ لوگ اسے بہت ہی فتنہ انگیز نظریہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اسے کیا کیجیے کہ ہر روز کی زندگی میں یہ نظریہ صحیح ثابت ہوتا ہے!

کسی نظامِ نو کی بنیاد قدیم سے بغاوت کیے بغیر قائم نہیں ہوتی۔ لوگ اسے بہت ہی شر انگیز نظریہ قرار دیتے ہیں لیکن ہر روز کی زندگی میں اس کی صداقت عیاں ہے۔ موجودہ حالات سے بیزاری اور نفرت کا جو پہلو "ادا بدایونی" کے کلام میں نمایاں ہے اس کی توضیح ان ہی فتنہ انگیز نظریوں سے ہوتی ہے۔ وہ خود اپنی بیزاری اور یاس کے ہر نقش پر اُمید، آرزو اور ارادہ کی ضرب لگاتی ہیں۔

مثلاً فرماتی ہیں:-

ظلمتِ دشت میں بھٹکا ہوا راہی بھی نہیں

رات کے سینے میں ارمانِ سحر سو بھی چکا

بے وفا راہوں میں پیمانِ سفر کھو بھی چکا

وقت کے ہاتھ میں یادوں کا دیا بھی نہ رہا

ریت کے ماتھے پہ نقشِ کفِ پا بھی نہ رہا

اور خود ہی اس طلسمِ یاس کو یوں توڑتی ہیں کہ

حوصلے اور نئی شمعیں جلائیں گے ابھی

نئے راہی نئی منزل نیا سامانِ سفر

نئے پیمان نئے عزم نئی شانِ سفر

ظلم پروردہ تمناؤں کی شہ پائے ہوئے

سر اٹھائے ہوئے بپھرے ہوئے تھرائے ہوئے

زخم کھائے ہوئے کچلے ہوئے ٹھکرائے ہوئے

یعنی ہر گام پہ منزل کی قسم کھائے ہوئے

قافلے اور اسی راہ سے آئیں گے ابھی!

پھر فرماتی ہیں:

زمیں پہ شعلہ باریاں فلک پر گڑگڑاہٹیں

کہ سن رہے ہیں چشم و دل نظامِ نو کی آہٹیں

بہار بیت ہی چکی خزاں بھی بیت جائے گی

مگر میں ایک سوچ میں پڑی ہوئی ہوں آج بھی

وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں

نظامِ نو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا یا نہیں

لیکن نظامِ نو تو شاعرہ کو اس کا ساز دے چکا اور اسی ساز کی آواز ہم ان

اوراق میں سن رہے ہیں۔ خود وہ اب تسلیم کرتی ہیں۔

افق کے پار ستاروں کی خوابگاہوں میں
فسوں بدوش نظارے بلا رہے ہیں مجھے

جس طرح "ادا بدایونی" نے ان فسوں بدوش نظاروں کی دعوت قبول کر لی ہے اے کاش کہ ہندوستان کی اور بھی لاتعداد خواتین افق کے پار ستاروں کی خوابگاہوں پر اپنے افکار کی کمند پھینک سکیں اور آنے والے نظامِ نو کے جدید ادب کی صفوں میں ہم انہیں کہتے سنیں کہ

یہ میرے دل کو خیال آتا ہے
زندگی کیوں فقط اک آہِ مسلسل ہی رہے
کیوں نہ بیدار کروں وہ نغمے
وقت بھی سن کے جنہیں تھم جائے
رہگزاروں میں یہ بہتا ہوا خوں
موت کے سائے تلے سسکیاں بھرتی ہے حیات
اس امنڈتے ہوئے طوفاں سے کنارا کر لوں
یہ سسکتی ہوئی لاشیں یہ حیاتِ مردہ
یہ جبینیں جنہیں سجدوں سے نہیں ہے فرصت
یہ امنگیں جنہیں فاقوں نے کچل ڈالا ہے
یہ بلکتی ہوئی روحیں یہ تڑپتے ہوئے دل
یہ ترستی ہوئی نظریں یہ ڈھلکتے ہوئے اشک

ان ڈھلکتے ہوئے اشکوں کو چرا کر میں بھی

اپنے ایوانِ تصور میں چراغاں کر لوں!

شاعرہ نے جو کچھ بھی اس رنگ میں کہا ہے اس میں قدیم اور فرسودہ نظامِ زندگی کے خلاف بغاوت کا ایک بے پناہ جذبہ کارفرما ہے۔ ان کی آواز سراپا طلب اور احتجاج ہے۔ ان کے اندازِ بیان سے ایک ایسی قوتِ ارادی مترشح ہے جس کے بغیر جدید ادب کے کسی معمار کا پیام مؤثر نہیں ہو سکتا۔

عہدِ جدید کی گود میں ہر اس معمار کے لیے ایک جگہ موجود ہے جو شعر و سخن کو محض فنکاری کے دائرے سے باہر لے جا کر عوام کی زندگی کے وسیع تر میدانوں میں حقوقِ انسانیت کے مطالبے کی آواز بنا دے۔ ہم اب اس منزل سے بہت دور نکل چکے ہیں جہاں اس موضوع پر بحث ہوا کرتی تھی کہ آیا صحیح نظریہ ادب برائے ادب ہے یا ادب برائے زندگی۔ شاعر کی حسن کاری اب بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے اور کمالِ فن کا اب بھی ایک معیار قائم ہے لیکن زمانے کے تقاضوں نے جن شعرا کو جدید ادب کے طرف مائل کر دیا ہے وہی ان تقاضوں کی صحیح تعمیل کر رہے ہیں۔ اس عہدِ حیات میں حسن کاری اور آرٹ کا جو صحیح مقام ہے اسے خود علامہ اقبال نے اپنے صرف ایک ہی مصرعہ میں بیان کر دیا تھا۔

شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

اقوامِ عالم کی زندگی میں شمشیر و سناں اور طاؤس و رباب کی تقسیم نظمِ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک لازوال قانون ہے۔ ہمارا جدید ادب طاؤس و رباب کی منزل کو پیچھے چھوڑ چکا ہے اور زندگی کے دائرے میں وہ قدیم فن اور حسن کاری

کے نقطۂ نظر سے گزر کر پھر زندگی کے ان واجبات کو پکار رہا ہے جن کو اقبال کی اشاریت نے "شمشیر و سناں" کے نام سے موسوم کیا تھا۔ جدید ادب کے اس چھوٹے سے مگر تیز گام قافلے میں جب کسی نئے مسافر کا اضافہ ہوتا ہے تو میں اس مسافر کو فن اور قواعد کے ترازو میں تولنے کے بجائے اس طرح اس کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ یہ ایک اور بلاکوش اور بلاکیش محفلِ زنداں میں آیا جو زندگی کے نئے ساز پر نئے گیت گاتا ہے!!

محترمہ اداؔ بدایونی کے کلام پر میں جو ان چند سطروں کے لکھنے پر آمادہ ہُوا تو اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ میری تھکی ہوئی عمر ابھی اتنی نہیں تھکی ہے کہ جدید ادب کی شورش انگیزی کا خیر مقدم بھی نہ کر سکے!!

حیدر آباد۔ دکن
یکم فروری ۴۶ء

محمد عبد الغفار

پیش لفظ

زندگی تیرے لیے خواب سہی، گیت سہی

نقرئی گیتوں کی زرکار سجیلی کرنیں

نور برساتی رہیں تیرے شبستانوں میں

زندگی ٹھوکریں کھاتی رہی طوفانوں میں

تو کہاں سوچتی خوابوں کی سجل باہوں میں

کیوں ڈھلکنے سے بھی معذور رہا کرتے ہیں

وہی آنسو جنہیں مبہم سا سہارا نہ ملا

کسی دامن کسی آنچل کا کنارا نہ ملا

کیسے محبوب تمناؤں کی کومل کلیاں
آگ اور خون کے عفریت نگل جاتے ہیں
کیسے تہذیب کے معیار بدل جاتے ہیں
تو کہاں سنتی وہ بے باک نوائی جس کو
لوریاں دے کے سلایا ہے نہاں خانوں میں

انہیں روندی ہوئی ٹھکرائی ہوئی راہوں میں
کتنی نوخیز امیدوں کے سجیلے سپنے
کتنی معصوم امیدوں کے لجیلے سپنے
چند دالوں کے عوض بکتے رہے بکتے رہے
بربریت کے ستم سہتے رہے سہتے رہے

زندگی میرے لیے خواب نہ تھی، گیت نہ تھی

(۱)

سوز بھی کم کم ساز بھی کم کم

(فراق)

احساسِ اولیں

ایک موہوم اضطراب سا ہے
اک تلاطم سا، پیچ وتاب سا ہے
امڈے آتے ہیں خود بخود آنسو
دل پہ قابو نہ آنکھ پر قابو
دل میں اک درد میٹھا میٹھا سا
رنگ چہرے کا پھیکا پھیکا سا
زلف بکھری ہوئی پریشاں حال
آپ ہی آپ جی ہوا ہے نڈھال

سینے میں اک چبھن سی ہوتی ہے
آنکھوں میں کیوں جلن سی ہوتی ہے
سر میں پنہاں تصوّرِ موہوم
ہائے یہ آرزوئے نامعلوم
ایک نالہ سا ہے بغیر آواز
ایک ہلچل سی ہے نہ سوز نہ ساز
کیوں یہ حالت ہے بیقراری کی
سانس بھی کھل کے آ نہیں سکتی
روح میں انتشار سا کیا ہے
دل کو انتظار سا کیا ہے

محبّت

محبت ایک راز ہے!
وہ راز۔ روح میں رہے جو حسن بن کے جلوہ گر
نگاہ جس کی دید کی نہ تاب لائے عمر بھر
شعور سے بلند تر
محبت ایک راز ہے!

محبت ایک ناز ہے!
وہ ناز جو حیات کو نشاط جاوداں کرے
زمیں کے رہنے والوں کو جو عرش آشیاں کرے

یہ فرقِ ایں و آں کرے
محبت ایک ناز ہے

محبت ایک خواب ہے!
وہ خواب جس کی سرخوشی پہ جنتیں نثار ہوں
فسانہ سازِ زندگی کی عشرتیں نثار ہوں
حقیقتیں نثار ہوں
محبت ایک خواب ہے!

محبت اک گناہ ہے!
لٹے نہ کاروانِ بو، رہے جو غنچہ میں نہاں
صدف سے باہر آ کے پھر گہر کی آبرو کہاں
ہوئی جو محرمِ زباں
محبت اک گناہ ہے!

محبت اک نگار ہے!

تمام صدق و سادگی، تمام حسن و کافری
تمام شورش و خلش، مگر بطرزِ دلبری
شکست جس کی برتری
محبت اک نگار ہے!

یہ آنسو

کیوں آج تری چشمِ سیہ غم نواز ہے
ٹپکے مژہ سے اشکِ گرانبار کس لیے
بے قدر ہو گئے دُرِ شہوار کس لیے
کیوں آج تیرے ناز میں رنگِ نیاز ہے
قسمت نے کس لیے تجھے ناشاد کر دیا
کس کو خبر تھی رنج ہے اس بن کے واسطے
وہ مختصر سا عیش تھا اس دن کے واسطے

دُنیائے انبساط کو برباد کر دیا
ظُلماتِ غم میں جلوۂ امید کھو گیا

شہزادیٔ نشاط اور آہوں سے ہمکنار
آہوں سے ہمکنار، کراہوں سے ہمکنار!
کیوں وقفِ نالہ بربطِ ناہید ہو گیا

پروردۂ بہار۔ نصیبِ خزاں! غضب!!
مجبورِ آہ لعلِ تبسّم فشاں! غضب!!

اُن کی شکایتوں کا لکھا میں نے یہ جواب...!"

تم تو وفاشناس و محبت نواز ہو!
ہاں میں دغا شعار سہی، بے وفا سہی!
تم کو تو ناز ہے دلِ الفت نصیب پر
مَیں ماجرائے درد سے ناآشنا سہی
ناآشنائے درد کو شکوہ سے کیا غرض
تم کو شکایتِ غمِ فرقت روا سہی
تم کو تو رسمِ ظلم و ستم سے ہے اجتناب
تم سربسر عطا سہی، اور میں خطا سہی

مَیں محفلِ نشاط میں نغمہ طرازِ شوق
تم زیرِ لب تبسمِ حسرت نما سہی
تم کو خیالِ غم سببِ اضطرابِ دل
مجھ کو بیانِ درد مسرت فزا سہی
تم کو مرا تساہلِ خط وجہِ انتشار
مجھ کو تمہارا طرزِ تغافل "ادا" سہی
مَیں انتظارِ خط کی صعوبت سے بے خبر
تم انتظارِ خط میں سدا مبتلا سہی
میں اشتیاقِ دید و مروت سے بے نیاز
اور تم نگار خانۂ مہر و وفا سہی!
ہے اک وفا شناس کو پاسِ وفا ادا
ورنہ کہاں ھم اور کہاں بخششِ خطا

عیدِ نظّارہ

مژدہ نگاہِ شوق! کہ عید نظارہ ہے
پلکیں کسی کی راہگزر میں بچھاؤں میں
آمد ہے آج ایک سراپا بہار کی
کس کس طرح نہ غمکدہ اپنا سجاؤں میں
خورشید کی جبیں سے کرن مُستعار لوں
مہتاب سے ضیائے جواں مانگ لاؤں میں

دامانِ ابرِ تیرہ سے گوہر سمیٹ لوں
قوسِ قزح کا رنگِ عروسی چُراؤں میں
باغِ ارم سے آرزوئے رنگ و بُو کروں
روئے شفق سے غازۂ احمر چھڑاؤں میں
شبنم سے اشکہائے گہر تاب چھین لوں
غنچے کے لعلِ لب سے تبسّم چراؤں میں
بُلبل سے پاکبازیٔ الفت طلب کروں
معصومیٔ شباب کو پھولوں سے چھاؤں میں
جذب و وفا و ہمتِ پروانہ چاہیے
بہرِ گداز و سوز سوئے شمع جاؤں میں
رنگینیاں شراب سے تھوڑی سی مانگ لوں
اور سادگیٔ طفلکِ معصوم پاؤں میں!

ظلمت میں ہوگا نور فشاں ماہِ نیم ماہ
بہرِ نثار ساغرِ انجم منگاؤں میں!
وہ اور میرے گھر میں ہوں مہمان خوشا نصیب!
گلہائے اشکِ سرخ سے دیپک جلاؤں میں
آنکھوں کو میری دولتِ دیدار ہے نصیب
خود کو نہ ان کے شوق میں کیوں بھول جاؤں میں
وہ ابتدا سے آج سنیں گے حدیثِ غم
بلبل کی طرزِ نغمہ رنگیں اڑاؤں میں
جب حسن ہی نیاز پہ مائل ہو اے ندیم
پھر کیا صلاح آج نہ کیوں روٹھ جاؤں میں
اے اضطرابِ شوق! سنبھلنے دے اس قدر
ہاتھوں پہ رکھ کے دل کو پئے نذر لاؤں میں

اور اس کے بعد عرض کروں حکم ہو اگر
رنگین ایک مطلع آدا کا سناؤں میں
"اے چشمِ مست تیرا اشارہ جو پاؤں میں
جو نغمے سو رہے ہیں انہیں بھی جگاؤں میں"

☆

ادھر بھی اک نظر اے جلوۂ رنگین و بیگانہ
طلوعِ ماہ کا ہے منتظر میرا سیہ خانہ

غزل

نہیں کہنے کے قابل ہمصفیرو! داستاں میری
کہ دستِ برق نے ڈالی بنائے آشیاں میری

مرے صیاد! کچھ تو رحم کر ان چار تنکوں پر
یہی لے دے کے ہے کل کائناتِ آشیاں میری

تمہیں اے بجلیو! پہلے مجھی کو پھونک دینا تھا
جلانا تھی اگر منظور شاخِ آشیاں میری

مرا حالِ زبوں کیوں درسِ عبرت ہو زمانہ کو
زباں زد کس لیے ہو داستانِ آشیاں میری

نہ ہوتا خانماں تو خانماں برباد کیوں ہوتی
ادا یہ رنگ لائی آرزوئے آشیاں میری

جوہی کی کلیاں

بہارِ خلد منظر جلوہ گر ہے
ہجومِ سبزہ تا حدِّ نظر ہے
ہوائے مست ہے بہکی ہوئی سی
سکوتِ شب تحیّر آزما ہے
جمالِ ماہ کیفیت فزا ہے
ہوا کے نرم جھونکے ہیں کہ آہیں
کہ بکھری بکھری نادیدہ نگاہیں!

ستارے یوں پلک جھپکا رہے ہیں
نگاہِ شوق سے شرما رہے ہیں
فلک سے چاند کی مغرور کرنیں
وفورِ شوق سے مسرور کرنیں،
برائے سیرِ گل آئی ہوئی ہیں
زمیں تا آسماں چھائی ہوئی ہیں
سرِ مژگاں ستارے کانپتے ہیں
کہ جو ہی کے شگوفے کھِل رہے ہیں
نزاکت آفریں، رعنا سمن بر
تخیل کے نشاط انگیز پیکر
کتابِ حسن کا عنوانِ رنگیں!
جواں فطرت کا ارمانِ بہاریں

جبینِ غنچہ پر شبنم نہیں ہے
عرق آلود روئے نازنیں ہے
یہ کلیاں ہیں کہ ماضی کی وہ یادیں
جنہیں ہنگامہ ہائے غم بھلا دیں!
بڑے نازوں کی یہ پالی ہوئی ہیں
مئے عشرت سے متوالی ہوئی ہیں
یہ جرأت آزما مبہم اشارے
ہیں کس کے منتظر رنگیں نظارے

بہار کا پہلا پھول

ہے زیبِ شاخ حسنِ گلستاں کہیں جسے
اک پھول جانِ کیفِ بہاراں کہیں جسے
یا خامۂ مصورِ رنگیں نگار کا ——
وہ نقشِ اوّلیں کہ پریشاں کہیں جسے
ابرِ کرم کا قطرۂ اوّل گہر بکف
افسانۂ بہار کا عنواں کہیں جسے
طفلی کا ایک گام سوئے منزلِ شباب
سرنامۂ صحیفۂ ارماں کہیں جسے

اک حرفِ آرزو جسے شوقِ گنہ کہیں
اک منفعل نگاہ پشیماں کہیں جسے
عصیاں کی بزمِ تیرہ میں اک نور کی کرن
اہلِ نظر بھی حاصلِ ایماں کہیں جسے
یا آرزوئے اوّل و مبہم کی قلب میں
پہلی تڑپ، جراحتِ مژگاں کہیں جسے
کھویا ہوا سا خوابِ جوانی بہار کا
تجدیدِ اضطراب کا ساماں کہیں جسے
یا رہگذارِ ناز میں مصروفِ جستجو
وہ چشمِ انتظار، کہ حیراں کہیں جسے
یا اوّلیں سرشکِ محبت سرِ مژہ
محرومیٔ نشاط کا پیماں کہیں جسے

"... تقریب تیرے یاد آنے کی"

غنچوں کا سنگھار ہو رہا ہے
سامانِ بہار ہو رہا ہے
جھونکے یہ ہوا کے بھیگے بھیگے
کیا کیا نہ امنگ جی میں اٹھے
کلیاں جو ادا سے پھوٹتی ہیں
جینے کی امیدیں ٹوٹتی ہیں

پھُولوں سے لدی ہوئی ہیں شاخیں
آنکھوں میں کھٹک رہی ہیں شاخیں
بھونرے سے سکھی یہ کوئی کہہ دے
گا گا کے کسی کو کیوں ستائے
لوچھائیں گھٹائیں اودی اودی
زلفیں وہ کسی کی بکھری بکھری
پُروا سے کوئی یہ جا کے پُوچھے
خوشبو یہ چرائی ہے کہاں سے
آتے ہیں امنڈ کے کالے بادل
(پھیلا ہُوا انکھڑیوں کا کاجل)
جنگل میں چمک رہی ہے بجلی
دل بن کے دھڑک رہی ہے بجلی

سبزہ یہ بگڑ کے بن رہا ہے
یا روٹھ کے کوئی من رہا ہے
پھولوں پہ یہ تتلیاں کہاں ہیں
یادیں کچھ ہیں کہ پرفشاں ہیں'

*

وہ بے نقاب سامنے آئیں بھی اب تو کیا
دیوانگی کو ہوش کی فرصت نہیں رہی

جھیل

بدلی مسرتوں کی ہر سو برس رہی ہے
اک خوابناک وادی آنکھوں میں بس رہی ہے
وادی کی گود میں یوں اک جھیل سو رہی ہے
خود چاندنی سمٹ کر آغوش ہو گئی ہے
صہبائے ارغواں کا ساغر چھلک گیا ہے
چشمِ نگار سے اک آنسو ڈھلک گیا ہے
کس سرمگیں نگہ سے مسحور ہو گئی ہے
مسحور ہو گئی ہے مغرور ہو گئی ہے

کیفِ شراب میں ہے ڈوبا ہُوا نظارا
کھوئی ہوئی نظر میں کھویا ہُوا نظارا

برنائیاں نچھاور عکسِ مہِ جواں پر
اک چاند ہے زمیں پر اک چاند آسماں پر

ہو ہو کے مست و بیخود ندیں چڑھا رہی ہے
شبنم کی شاہزادی موتی لٹا رہی ہے

تاروں کا عکس دلکش ہے سطحِ مرمریں پر
افشاں چنی ہوئی ہے پیشانیٔ حسیں پر

محوِ خرامِ نازکِ دوشیزۂ صبا ہے
سبزے کی جنبشوں میں اک دل دھڑک رہا ہے

لہروں کی سلوٹوں میں کچھ پھول کانپتے ہیں
بستر جو پُر شکن ہے پہلو بدل رہے ہیں

لرزاں ہے کس لیے یوں؟ ہے کیوں شکن جبیں پر؟
کیا یاد آ رہا ہے؟ کیوں ہو رہی ہے مضطر؟
کیوں دل دھڑک رہا ہے؟ یوں بیقرار کیوں ہے؟
سوئے فلک نگاہِ حیرت شعار کیوں ہے
امید کا گھروندا پل میں گرا دیا ہے!
تجھ کو بھی کیا کسی نے دل سے بھلا دیا ہے؟

صبحِ بنارس

گھونگھٹ اُلٹ رہی ہے رُخِ لالہ فام سے
عذرائے صبحِ حسنِ خود آرا لیے ہُوئے

سرگرمِ مشقِ ناز ہے مشاطۂ بہار
کیف و نشاط و رنگ کی دنیا لیے ہوئے

کلیوں کو بخشتی ہوئی اذنِ شگفتگی
پھُولوں کو رنگ و بو کا سندیسہ لیے ہوئے

دامن کشاں ہے ساحلِ گنگا کی آب و تاب
طغیانِ بے خودی کا اشارا لیے ہوئے

ہیں گلفروش لڑکیاں ہر سمت راہ میں
یا خود بہار ہے گلِ رعنا لیے ہوئے
خوشبو مچل رہی ہے ہواؤں کے دوش پر
اعجازِ گرمیٔ دمِ عیسیٰ لیے ہوئے
مستی بھری ہواؤں کے جھونکے، نہ پوچھئے
فطرت ہے آج ساغر و مینا لیے ہوئے
ہو جس کے آگے نغمۂ ناہید بھی خجل
موجِ نسیم ہے وہ ترانا لیے ہوئے
مغرور کر دیا ہے شعاعوں نے چوم کر
ذرّے بھی ہیں فروغِ ثریا لیے ہوئے
ہر گل، زفیضِ ناز، چمن در کنار ہے
ہر قطرۂ حقیر ہے دریا لیے ہوئے

شفاف سطحِ آب نہیں، دستِ ناز میں
آئینہ ہے عروسِ نظارا لیے ہوئے
محوِ خرامِ ناز ہیں دریا میں کشتیاں!
موجِ شمیمِ گل کا فسانہ لیے ہوئے
مندر کی آن بان ہے اس وقت دیدنی
کرنیں بڑھی ہیں تاجِ شہانہ لیے ہوئے
اشنان کرنے گھاٹ پر آئی ہیں دیویاں
آنچل کی اوٹ میں رُخِ زیبا لیے ہُوئے
آغوشِ رودِ آب میں ہیں مہ وشانِ شوخ
گویا جوابِ عقدِ ثریّا لیے ہوئے
یا صحنِ گلستاں میں پرافشاں ہیں تتلیاں
عکسِ جمالِ عارضِ سلمیٰ لیے ہوئے

یا کچھ کنول کھلے ہوئے چاندی کی جھیل میں
نظارہ و نظر کا تقاضا لیے ہوئے

وہ سر جھکا رہی ہیں عقیدت کی راہ سے
کونین خود ہے جن کی تمنا لیے ہوئے

مہتاب سی جبیں سے کرن پھوٹتی ہوئی
دنیائے آرزو کا اجالا لیے ہوئے

ژولیدہ گیسوؤں میں ہے مکھڑا یہ پھول سا
یا گود میں ہے چاند کو ہالا لیے ہوئے

مے خانۂ جمال کی کافر گھٹاؤں میں
طاقِ حرم کی شمع دل آرا لیے ہوئے

سامانِ کفرِ عشق مہیّا ہیں سر بسر
ہر ہر قدم پہ دعوتِ سجدہ لیے ہوئے

ساحل کے ذرہ ذرہ میں غلطیدہ ہے نظر
ارمانِ دید و ذوقِ تماشا لیے ہوئے

سجدے تڑپ رہے ہیں جبینِ نیاز میں
سر ہیں کسی کی زلف کا سودا لیے ہوئے

ہیں دل کے ہاتھوں جینے سے بیزاریاں وہاں
باہر ادا ہے وعدۂ فردا لیے ہوئے

تسکینِ نامراد کی اک سمت کشمکش
اور اک طرف ہے درد مداوا لیے ہوئے

کس کو خبر، ہیں کتنے بھٹکتے ہوئے قدم
مخمور انکھڑیوں کا سہارا لیے ہوئے

ناآراستہ حسن

معصوم و سادہ الھڑ جوانی!
ہونٹوں میں غلطاں کوثر کے دھارے
دیکھیں جو رشکِ مہتاب مکھڑا
حیران و ششدر رہ جائیں تارے
ساری کا آنچل ڈھلکا ہوا ہے
اوروں سے بے سدھ خود کو بسارے
ہے سادگی خود حشرِ مجسم!
دل کی تمنا کس کو پکارے؟

گھائل کریں اور مُڑ کر نہ دیکھیں
تڑپیں کہ سکیں نینوں کے مارے
بخشیں دلوں کو ذوقِ پرستش!
نیچی نظر کے مبہم اشارے
سنبھلی ہوئی سی، ٹھٹکی ہوئی سی
نظروں کی زد پر سادہ نظارے
رُخ پر ہوا سے اک لٹ پریشاں
ارمان ڈھونڈے کیا کیا سہارے
الجھے ہوئے ہیں الجھا رہے ہیں
اے کاش کوئی گیسو سنوارے

ایک تصویر دیکھ کر

پیشِ نگاہِ آرزو
کس شوخ کی تصویر ہے
مکھڑا ہے یہ مہتاب سا
جیسے شگفتہ روئے گُل
رنگین سا، شاداب سا
پاکیزہ جیسے بوئے گُل
معصوم عشووں کی قسم
تقدیس کی تفسیر ہے

ہے کاکلِ عنبر فشاں
اُمڈی ہوئی کالی گھٹا

آنکھوں میں ہے سوئی ہوئی
اک نا شنیدہ داستاں
چپ چپ سی، کچھ کھوئی ہوئی
چشمِ فلک سے بدگماں

یا پھُول کی اک پنکھڑی
آزردۂ موجِ ہوا

یوں اک تبسّم کی کرن
ہونٹوں پہ آکر رہ گئی
گویا لبِ نازک سے اب
ارشاد فرمانے کو ہے

صبر و سکون و ہوش سب
برباد فرمانے کو ہے
یا صبح کو تو رس کلی
کچھ کسمسا کر رہ گئی!

بُت خانۂ آذر کا ہے
اک شاہکارِ مرمریں
مکھڑے پہ چاندی کی جھلک
آنکھوں میں خوابیدہ حیا
ہونٹوں میں کلیوں کی دھمک
انداز میں ناز و ادا
نازک مثالِ برگِ گُل
شیریں ادا، ناز آفریں

فطرت کی چشمِ ناز کا
اک خوابِ معصومانہ ہے
پہلی کرن ہے صبح کی
مچلی ہوئی، سنبھلی ہوئی
یا ایک نازک تیتری
ٹھہری ہوئی، ٹھٹکی ہوئی
یا شرمگیں کلیوں کا اک
ارمانِ بے تابانہ ہے
آنسو ہے اک ڈھلکا ہوا
یا حسن کے رخسار کا
تابندہ و پُر نور ہے
رنگیں شراروں کی طرح

دستِ دعا سے دُور ہے
پاکیزہ تاروں کی طرح

یا صورتِ انساں میں ہے
اِک راگ موسیقار کا

یا شاعرِ مغرور کا
اک سجدۂ بے تاب ہے

جو آستانِ ناز پر
اس نے لٹایا تھا کبھی

اک شعرِ دل کے ساز پر
بھولے سے گایا تھا کبھی

شرمندۂ تعبیر وہ
شاعر کا رنگیں خواب ہے

اللہ ری یہ تمکنت
یہ حُسن، یہ برنائیاں

اپنے نشہ میں چُور ہے
مثلِ غزالِ نازنیں
سُلطانۂ مغرور ہے
کافر ادا و مہ جبیں

ہے سجدہ گاہِ مہر و مہ
پاکیزگی کا آستاں

ہر ہر ادائے جانفزا
ہے دل نواز و دلنشیں

مست انکھڑیوں کے جام میں
غلطیدہ پیمانِ وفا!

زلفِ سیہ کے دام میں
لرزیدہ ارمانِ وفا
کیوپڈ کا تیر بے پنہ
دینس کی تشکیلِ حسیں

جوش و خروشِ آرزو
دیوانگی بر دوش ہے
تیرِ مژہ کی زد میں ہے
ہوشِ خرد کا کارواں

یا حسن کے معبد میں ہے
پندارِ عشق کامراں!
اللہ ری مدہوشیاں
دل جلوہ گاہِ ہوش ہے

محرومیٔ تقدیر سے

اِک اشک ہے زیبِ مژہ

محبوبۂ ناز آفریں

کیا چیز تجھ کو نذر دوں

اے کاش یہ جانِ حزیں

تجھ پر نچھاور کر سکوں

آنسو کا اک قطرہ ہے بس

نذرِ ادائے بے نوا

پروین کے نام

خدا کرے تجھے ہم تابِ مہر و مہ پروین

مثالِ انجمِ رخشندہ سرفراز رہے

سبق لے گوہرِ تاباں سے تیری معصومی

جہانِ حرص و ہوا میں بھی پاکباز رہے

یہ کائنات، کہ مدفن ہے آرزوؤں کا!

تو اس دیار میں مثلِ نوائے ساز رہے

خدا سے چشمِ حقیقت نگر ملے تجھ کو

کہ تو کبھی نہ اسیرِ "حق و مجاز" رہے

سرشکِ چشمِ مصیبت زدہ پہ کانپ اُٹھے
ہمیشہ دل کے دکھانے سے احتراز رہے
ترے دماغ کو وہ عزمِ استوار ملے
کہ تیری راہ میں کوہِ گراں گداز رہے
دلِ ایاز کو بخشے مذاقِ آزادی!
نیاز میں بھی اِک اندازِ مشقِ ناز رہے
عطا ترے دلِ نازک کو ہو وہ سوز و گداز
کہ تیرے دم سے تری قوم سرفراز رہے
مٹا دے ہند سے تفریقِ حاکم و محکوم
تو وہ کلی ہو گلستاں کو جس پہ ناز رہے

بہار کا راگ

ننھی ننھی حسین کلیوں پر!!
ہلکی ہلکی سی پڑ رہی ہے پھوار
ہائے ساون کی مست دیوی کے
گھنگھروؤں کی رچی رچی جھنکار
یوں بجاتی ہے لیلئ فطرت
دھیرے دھیرے سے بوندیوں کا ستار
عشق کا دیوتا بصد تمکین
سازِ دل پر ہو جیسے زمزمہ باز!

تجدید

ہنگامۂ نشاط کا ساماں ہے آج کیوں؟
دورِ شراب گردشِ دوراں ہے آج کیوں؟
مفہومِ عیش روح پہ عریاں ہے آج کیوں؟
گریہ حریفِ شوقِ فراواں ہے آج کیوں؟
کیوں دامنِ نگاہ میں کانٹا بھی پھول ہے
رنگِ خزاں حریفِ بہاراں ہے آج کیوں؟
میرے لبِ خموش کو آئینِ ناز میں،
عرضِ نیازِ شوق کا فرماں ہے آج کیوں؟

شرمندۂ خیالِ تمنا رہا جو دل
دیوانگیٔ شوق پہ نازاں ہے آج کیوں؟
جو کشتۂ تغافلِ پیہم تھا وہ دماغ
آزردۂ ندامتِ جاناں ہے آج کیوں؟
محرومِ یک نگاہِ ترحم تھی جو وہ روح
لذت کشِ تبسّمِ پنہاں ہے آج کیوں؟
وہ چشمِ انتظار کہ محرومِ جلوہ تھی
مژگانِ اشکبار پہ خنداں ہے آج کیوں؟
وہ نالہ جو ہنوز نہ تھا لب سے آشنا
حُسنِ فروغِ شمعِ شبستاں ہے آج کیوں؟
جو مِل گیا تھا کثرتِ اندوہ سے مجھے
برباد وہ سکونِ دل وجاں ہے آج کیوں؟

آمادۂ کرم ہے یہ کس کی نگاہِ ناز
دل شکوۂ ستم سے پشیماں ہے آج کیوں؟
اندازِ بے نیازئ جاناں کے مَیں نثار!
سرگرمِ کارِ غمزۂ جاناں ہے آج کیوں؟
کس کے پیامِ ناز کا یہ فیض ہے ادا
دل جلوہ گاہِ نرگس و ریحاں ہے آج کیوں؟

اشعار

اور کچھ دیر لب پہ آہ رہے
اور کچھ ان سے رسم و راہ رہے

پھر نگاہوں کو آزما لیجئے!
پھر وفاؤں پہ اشتباہ رہے

دل کی آزردگی بجا لیکن
وہ بھی محرومِ یک نگاہ رہے

یادِ ماضی

آغوشِ فلک میں ہیں جھلکتے ہوئے تارے
یا ساغرِ زر ساقیٔ مہ وش نے سنوارے

تاروں بھرا آکاش ہے یا رات کی دیوی
پیشانیٔ زرپاش پہ افشاں کو سنوارے

جھرمٹ میں ستاروں کے ہے مہتاب درخشاں
پہلو میں لیے ماضیٔ سوزاں کے شرارے

یا حلقۂ سیمینِ حسینانِ جہاں میں
ہے آئینہ سیما کوئی چہرے کو نکھارے

ہاں! ابرِ سیہ انجمِ رخشندہ پہ چھا جا
آنکھوں تلے پھرنے لگے ماضی کے نظارے
تاروں کی طرح میرے تصور میں ہیں روشن
وہ لمحے جو فردوسِ محبت میں گزارے
آنکھوں سے ادھر اشکِ گہر تاب کی بارش
گردوں پہ ادھر سسکیاں بھرتے ہوئے تارے
کیا بھول گئے ہیں وہ محبت کی کہانی
کیا یاد انہیں اب نہیں جمنا کے کنارے
بھولے سے نہ وہ جن کو کبھی یاد کریں گے
جیتا ہے کوئی اب انہیں یادوں کے سہارے
ہے چاند اسی حسنِ خراماں کا پیامی
تارے ہیں انہیں شوخ نگاہوں کے اشارے

دیدار میسر ہو جو نظروں کو دوبارہ
روشن کروں سینے میں تمنّا کے شرارے

میرے مہِ تاباں سے آدا کون یہ پوچھے
تنہا کوئی کب تک شبِ مہ تاب گزارے

التفاتِ گریزاں

تمہیدِ اضطرابِ فراواں ہے آج پھر
رنگیں قبا عروسِ گلستاں ہے آج پھر
شہزادیٔ نشاط کی نازک خرامیاں
وحشت فزا ہجومِ بہاراں ہے آج پھر
شبنم نے برگِ گُل سے دمِ صبح کیا کہا؟
گوہر فروشِ دامنِ مژگاں ہے آج پھر
صبحِ بہار ہونے لگی کس لیے طلوع
میری حریف گردشِ دوراں ہے آج پھر
نظروں کو ناگوار جمالِ عروسِ گل
کانوں پہ بار شورِ ہزاراں ہے آج پھر

سر کو کسی کے گوشۂ داماں کی آرزو
پائے جنوں کو شوقِ بیاباں ہے آج پھر
بھرنے پر آ گئے تھے مرے زخمہائے دل
گلشن میں شمعِ لالہ فروزاں ہے آج پھر
بے وجہ غم نوائیاں اے ہم نشیں! نہیں
ابرِ سیہ کی زلف پریشاں ہے آج پھر
کیوں کر بھلاؤں کاکلِ عنبر فشاں کو میں
دوشِ فضا پہ نکہتِ رقصاں ہے آج پھر
وہ ہی نہیں تو کیوں ہوں یہ عشرت نوازیاں
بارِ گراں فروغِ شبستاں ہے آج پھر
شاید کسی نے یاد کیا ہے ہمیں ادا
کیوں ورنہ اشک مائلِ طوفاں ہے آج پھر

نئی موجِ طوفاں

بہت دن سے تھی بزمِ دل سرد و ویراں
یہ کون آگیا آج مست و غزل خواں
یہ کس نے نقاب اپنے رُخ سے اُلٹ دی
گلے مِل رہے ہیں بہم کفر و ایماں
یہ کیوں وجد سا دل کو آتا ہے پیہم
ہوا کون مشقِ ستم سے پشیماں
پلک پر ستارہ سا تھا ایک روشن
یہ کس رہگزر میں ہُوا ہے چراغاں

فریبِ تمنّا سے ہوش آچکا تھا
ہے جنبش میں کس کا لبِ مست پیماں
امیدوں کا روشن دیا بجھ چکا تھا
یہ پھر کس نے شمعِ نظر کی فروزاں
یہ پھر کس نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا
مچلنے لگے سینکڑوں شوخ ارماں!
میں کانٹوں سے ہی دل کو بہلا چکی تھی
یہ کس کی ہے آمد گلستاں گلستاں
گلستاں گلستاں یہ آمد ہے کس کی؟
یہ کون آ رہا ہے خراماں خراماں
بہارِ مجسم، شرابِ مشکّل
یہ ماہِ خراماں، یہ فردوسِ رقصاں

گھنیری گھٹاؤں میں بجلی کی چشمک
یہ لب ہائے لعلیں، یہ زلفِ پریشاں
یہ نیچی نگاہوں کا شیریں تبسّم!
تمنائے گل، آرزوئے بہاراں
جبیں پر وفا کا تقاضائے مبہم
پیامِ تمنا نگاہوں میں غلطاں
مرے جامِ بشکستہ کی خیر یا رب!
کہ ہے چشمِ سرشار محشر بداماں!
زہے بے نیازی! زہے دلنوازی
ہے پرسش پہ آمادہ حسنِ گریزاں
بہت دن سے کشتی تھی مرہونِ ساحل
مبارک نئی موجِ طوفاں!

غزل

خلشِ تیرِ بے پناہ گئی
لیجیے ان سے رسم و راہ گئی

آپ ہی مرکزِ نگاہ رہے
جانے کو چار سُو نگاہ گئی

سامنے بے نقاب بیٹھے ہیں
وقعتِ حُسنِ مہر و ماہ گئی

اس نے نظریں اٹھا کے دیکھ لیا
عشق کی جراتِ نگاہ گئی

انتہائے جنوں مبارک باد
پرسشِ حال گاہ گاہ گئی

مر مٹے جلد باز پروانے
اپنی سی شمع تو نبھا گئی

دل میں عزمِ حرم سہی لیکن
ان کے کوچہ کو گریہ راہ گئی

خیر مقدم

ہر ایک حرفِ آرزو کو داستاں کیے ہوئے
زمانہ ہو گیا ہے ان کو میہماں کیے ہوئے
سرودِ عیش تلخیٔ حیات نے بھلا دیا
دلِ حزیں ہے بے کسی کو حرزِ جاں کیے ہوئے
بہارِ حُسن و دلبری کا خواب پھر سے دیکھ لوں
خیالِ حسن و دلبری کو جاوداں کیے ہُوئے
کلی کلی کو گلستاں کیے ہُوئے وہ آئیں گے
وہ آئیں گے کلی کلی کو گلستاں کیۓ ہوئے

سکونِ دل کی راحتوں کو آج ان سے مانگ لوں
حدیثِ آہِ نیم شب سناؤں گی، سناؤں گی
سکونِ دل کی راحتوں کو بیکراں کیے ہوئے
زبانِ شبنم و گہر کو ترجماں کیے ہوئے
وہ آرزوئے دل کی ہمتیں بڑھائیں شوق سے
غرورِ عشقِ بے نوا کو کامراں کیے ہوئے
وفورِ شوق و بے خودی ٹھہر ٹھہر دلِ حزیں!
نگاہِ شوق و بے خودی کا امتحاں کیے ہوئے
تجلیاں لیے ہوئے وہ آرہے ہیں سوئے دل
نگاہ و دل کی وسعتوں کو لامکاں کیے ہوئے
وہ آئیں گے تو آئیں گے جنونِ شوق اُبھارنے
وہ جائیں گے تو جائیں گے خرابیاں کیے ہوئے

متاعِ صبر و ہوش کو لٹاؤں ان کی راہ میں
وداعِ صبر و ہوش کو متاعِ جاں کیے ہوئے

میں ان کی بھی نگاہ سے چھپا کے ان کو دیکھ لوں
کہ ان سے بھی ہے آج رشک بدگماں کیے ہوئے

وقارِ عشق تو سہی، کریں وہ اعترافِ غم
نظر کو دل کی دھڑکنوں کا رازداں کیے ہوئے

سرِ نیاز و پائے ناز ابتدا تھی عشق کی
اب انتہائے بےخودی ہے سرگراں کیے ہوئے

یہ کیفِ انتظار ہے کہ ساری عمر کاٹ دوں
نظر کو وقفِ انتظارِ دلستاں کیے ہوئے

(۲)

پیامِ زندگیؔ تو نہ بن سکیں صد حیف
یہ اُودی اُودی گھٹائیں، یہ بھیگی بھیگی بہار!

(ادا)

تعمیرِ نَو

شرمندگیٔ کوششِ ناکام کہاں تک
محرومیٔ تقدیر کا الزام کہاں تک

دنیا کو ضرورت ہے ترے عزمِ جواں کی
سرگشتہ رہے گا صفتِ جام کہاں تک

کب تک ترے ہونٹوں پہ حدیثِ رخِ تاباں
سر میں ترے سودائے لبِ بام کہاں تک

گیسوئے سیہ تاب و رخِ صاعقہ پرور
یہ مرگ و حیاتِ سحر و شام کہاں تک

لیلائے حقیقت سے بھی ہو جا کبھی دوچار
خوابوں کی حسیں چھاؤں میں آرام کہاں تک

رخ گردشِ دوراں کا پلٹ سکتا ہے تو خود
ناداں! گلۂ گردشِ ایام کہاں تک

کب تک ترے سینہ میں خلش تیرِ مژہ کی
یادِ لبِ میگوں سحر و شام کہاں تک

اے ذرّۂ ناچیز! خجل مہر کو کردے
افتادہ و تفسیدہ و گم نام کہاں تک

جز وہم نہیں قیدِ رہ و رسمِ زمانہ
اے طائرِ آزاد! تہ دام کہاں تک!

کم یاب نگاہیں

ارزاں وہ نگاہیں ہیں زمانے میں کہ جن کو
ہر منظرِ خوش رنگ کے انداز لبھائیں
ہر پھول کے دامن پہ کریں ناز سے سجدہ
ہر غنچۂ نورس کو کلیجے سے لگالیں
گہ تشنگیٔ خار سے لیں درسِ تشکر
ذرّوں کو گِنے ہمدم و ہمراز بنالیں
کم یاب ہیں لیکن وہ جہاں سوز نگاہیں
بڑھ کر جو کمندِ انجم و خورشید پہ ڈالیں

نقش برآب

سال ہا سال محبت جو بُنا کرتی ہے
رشتۂ قلب و نظر پیلۂ ریشم کی طرح
ایک جھونکا بھی حوادث کا اسے کافی ہے
پہلوئے گُل میں دھڑکتی ہوئی شبنم کی طرح

یہ محبت کے بنائے ہوئے ایوان بلند
ایک ٹھوکر بھی زمانے کی نہیں سہہ سکتے
آبگینے یہ بہت نازک و نارستہ ہیں
موج کی گود میں تا دیر نہیں رہ سکتے

گرم رفتار سبک سیر کے رہوارِ حیات
آرزوؤں کے گھروندے کو یہ ڈھا دے نہ کہیں
تلخ تر جام کے ہاتھوں میں نظامِ نو کے
خوابِ نوشیں کی حلاوت کو مٹا دے نہ کہیں

عشق کے ہاتھ میں روشن ہے جو ننھا سا دیا
عقل کی تند ہوا اس کو بجھا ہی دے گی
تو نے دیکھی ہی نہیں پنجۂ عسرت کی گرفت
روح کو قیدِ تمنا سے چھڑا ہی دے گی

گل ہی جائے گی کسی روز جنوں کی زنجیر
وقت ہر خواب کی تعبیر بتا دیتا ہے
کروٹیں لیتا ہے احساس جو بیداری کا
لوریاں دے کے امنگوں کو سلا دیتا ہے

نقش بر آب ہے وابستگیٔ حسن و شباب
نکہتِ گل کی طرح عشق ہے پابندِ ہوا
اس سے بہتر تھا کہ مجھ سے تجھے نفرت ہوتی
پھول مرجھاتے ہیں کانٹا نہیں مرجھا سکتا

تیر نفرت کا رہا کرتا ہے دل میں پیوست
شمع یہ تیرگیٔ غم میں تابندہ رہے
دستِ نفرت کی بنائی ہوئی دیوار اُدا
سنگ و آہن کی طرح پختہ و پائندہ رہے

عزم ہو جائیں گے افسردہ، ارادے مفلوج
گوش لذت کشِ کلبانگِ جلاجل کیوں ہو
منزلیں اور بھی کتنی ہیں محبت کے سوا
روحِ آزاد گرفتارِ سلاسل کیوں ہو!

بیزاری

زیست اک خوابِ طربناک و فسوں ساز سہی
رس بھرے نغموں کی اک دلنشیں آواز سہی
فرشِ مخمل بھی، زر و سیم کی جھنکار بھی ہے
جنتِ دید بھی ہے، عشرتِ گفتار بھی ہے،
چشمِ سرشار کا اعجاز سہی
زیست اک خوابِ طربناک و فسوں ساز سہی !

قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود

یہ خموشی، یہ تسلی، یہ گرانبار سکوت
شوق کو رخصتِ پرواز نہیں
رفعتِ روح کا در باز نہیں
جسم آسودہ سہی رُوح مگر ہے بے تاب
ایک بے نام تغیّر کے لیے
درد کی ٹیس سہی لذتِ جاوید نہیں
نغمہ امید نہیں
قہر ہے اُف یہ تسلسل، یہ تواتر، یہ جمود!

سوچتی ہوں کہ کوئی جملۂ تاریک ہے کیا
یہ گرانبار تسلسل
یہ حیاتِ جامد

جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال

کوئی روزن بھی نہیں، کوئی دریچہ بھی نہیں

ایک دنیا ہے کہ ہے تیرہ و محدود واداس

نور و نکہت سے گریزاں، مہ وانجم سے نفور

جس کی دیواروں کی سنگینی سے لرزاں ہے خیال!

کاش پڑجائے کہیں ایک خراش —— ایک شگاف

غم کے ہاتھوں ہی سہی

اور بھولے سے کبھی

کوئی آوارہ سی، چنچل سی کرن آنکلے

ایک لمحہ کے لیے

میرے تاریک گھروندے میں اجالا ہوجائے!

یہ مرے دل کو خیال آتا ہے

دیکھ تو سرمئی آکاش پہ تاروں کا نکھار
رات کی دیوی کے ماتھے پہ چنی ہے افشاں
یا کچھ اشکوں کے چراغ
ہیں کسی راہگذر میں لرزاں
آہ یہ سرمئی آکاش، یہ تاروں کے شرار!
یہ مرے دل کو خیال آتا ہے
دم اندھیرے میں گھٹا جاتا ہے
کیوں نہ ایوانِ تصور میں جلا لوں شمعیں

بربط و چنگ و رباب

منتظر ہیں مرے مضراب کی اک جنبش کے
زندگی کیوں فقط اک آہِ مسلسل ہی رہے
کیوں نہ بیدار کروں وہ نغمے
وقت بھی سُن کے جنہیں تھم جائے
رہگزاروں میں یہ بہتا ہوا خوں
موت کے سائے تلے سسکیاں بھرتی ہے حیات
اس امنڈتے ہوئے طوفاں سے کنارا کرلوں!
یہ سسکتی ہوئی لاشیں، یہ حیاتِ مُردہ
یہ جبینیں جنہیں سجدوں سے نہیں ہے فرصت
یہ امنگیں جنہیں فاقوں نے کچل ڈالا ہے
یہ بلکتی ہوئی روحیں، یہ تڑپتے ہوئے دل

یہ ترستی ہوئی نظریں، یہ ڈھلکتے ہوئے اشک
ان ڈھلکتے ہوئے اشکوں کو چرا کر مَیں بھی
اپنے ایوانِ تصور میں چراغاں کرلوں!
دیکھ کر رات کی دیوی کا سنگھار
وہم آتا ہے مگر
نغمہ و نَے کا سہارا لے کر
زندگی چل بھی سکے گی کہ نہیں
ان ستاروں کی دمکتی ہوئی قندیلوں سے
رات کے دل کی سیاہی بھی مٹے گی کہ نہیں!؟

لرزاں سائے

یہ کانپتے ہوئے تارے، یہ ماہتابِ جواں
یہ ناز آفریں گل اور یہ نازنیں کلیاں!
ہے ایک جلوۂ رنگیں کا منتظر بستاں
بس اک نگاہ سے محشر جگا تو سکتی ہوں
میں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں

نہیں کہ دل پہ درِ بزمِ عیش باز نہیں
حریمِ شوق میں مطرب نہیں کہ ساز نہیں
مرے نیاز کو خود آرزوئے ناز نہیں
جنونِ عشق پہ میں مسکرا تو سکتی ہوں
میں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں

مجھے فروغِ شبستاں کا گر خیال آئے
فرازِ چرخ سے قندیلِ ماہ آجائے
مرے جہاں میں مگر کانپتے ہیں کچھ سائے
مَیں آرزوؤں کی شمعیں جلا تو سکتی ہوں
مَیں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں
وہ سائے جن سے ابد تک مفر نہیں ممکن
یہ چاہتی ہوں بھلا دوں مگر نہیں ممکن
نظامِ جبر ہو زیر و زبر نہیں ممکن
میں اپنی بزمِ تمنّا سجا تو سکتی ہوں
مَیں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں

فریبِ ساغر و مینا کا دھیان آتا ہے
سرشکِ نرگسِ شہلا کا دھیان آتا ہے
کسی کے خونِ تمنا کا دھیان آتا ہے

میں دستِ شوق میں مہندی رچا تو سکتی ہوں
میں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں

خیال آتا ہے پامال زندگانی کا
امید و یاس کی الجھی ہوئی کہانی کا
غموں سے چُور سسکتی ہوئی جوانی کا

وفورِ شوق میں سجدے لٹا تو سکتی ہوں
میں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں

یہ آنسوؤں کا دھندلکا سہا نہیں جاتا
سسکتا چھوڑ کے آگے بڑھا نہیں جاتا
مئے نشاط کا ساغر پیا نہیں جاتا
مئے نشاط کے ساغر لنڈھا تو سکتی ہوں
میں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں

نگاہ دہر سے نظریں چُرا نہیں سکتی
غمِ حیات کی تلخی مٹا نہیں سکتی
حقیقتوں کو فسانہ بنا نہیں سکتی
خیال و خواب کی بستی بسا تو سکتی ہوں
میں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں

پنپنے دیں گے یہ آلامِ روزگار کہاں
خزاں کی گود میں ہنگامۂ بہار کہاں
ہوائے دہر، مگر ان کو سازگار کہاں
ترانہ ہائے وفا گنگنا تو سکتی ہوں
میں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں

بھٹکتا دیکھ کے میں اپنی راہ لوں ہمدم؟
سکوں کی چھاؤں میں کیونکر پناہ لوں ہمدم
کہ اتنی بھی نہیں فرصت کہ آہ لوں ہمدم
جوانیوں کے جواں گیت گا تو سکتی ہوں
میں اپنی دنیا کو جنت بنا تو سکتی ہوں

شکستِ ساز

میں نے گل ریز بہاروں کی تمنا کی تھی

مجھے افسردہ نگاہوں کے سوا کچھ نہ ملا

چند سہمی ہوئی آہوں کے سوا کچھ نہ ملا

جگمگاتے ہوئے تاروں کی تمنّا کی تھی

میں نے موہوم امیدوں کی پناہیں ڈھونڈیں

شدتِ یاس میں مبہم سا اشارہ نہ ملا

ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا نہ ملا

ہائے کس دشتِ بلاخیز میں راہیں ڈھونڈیں

اب فسوں ساز بہاروں سے مجھے کیا مطلب
آج ہیں میری نگاہوں میں وہ منظر توبہ
میں نے دیکھے ہیں لپکتے ہوئے نشتر توبہ
خلد بر دوش نظاروں سے مجھے کیا مطلب

آسماں نور کے نغمات سے معمور سہی
میں نے گھٹتی ہوئی چیخوں کے سنے ہیں نوحے
ہائے وہ اشک جو پلکوں سے ڈھلک بھی نہ سکے
زندگی حسن و جوانی سے ابھی چور سہی

کبھی ضو پاش ستاروں کی تمنا تھی مجھے
آج ذروں کو بھی مقصود بنا رکھا ہے
آج کانٹوں کو کلیجے سے لگا رکھا ہے
کبھی گلریز بہاروں کی تمنا تھی مجھے!

پیمانِ وفا

مَیں نے پیمانِ وفا باندھ لیا
ان چھنکتی ہوئی زنجیروں سے
جن کے سائے سے بھی ہے عار مجھے!

زندگی چین بھرا خواب نہ تھی
بسترِ مخمل و سنجاب نہ تھی
ساغرِ ناب نہیں، بادۂ انگور نہیں
لبِ جاں بخش نہیں، نرگسِ مخمور نہیں
میرا سرمایہ یہ زنجیریں تھیں
اپنے اجداد کی میراث سمجھ کر ہمدم

ان چھنکتی ہُوئی زنجیروں سے
مَیں نے پیمانِ وفا باندھ لیا

میرا یہ کلبۂ تاریک —— اداس
یہ عفونت زدہ پُرہول فضا
زہرآلود سہی
میرا مسکن، مرے احباب کا، اجداد کا مسکن ہے یہی!
تیرگی —— جس کا تصوّر بھی ہے دشوار تجھے
میری اک عمر یہیں گزری ہے
سوچ تو دل میں ذرا
تیری دنیائے طرب
مہ و خورشید بداماں، گل و گلزار بکف

دہر میں جنّتِ موعود سہی
نورِ خورشید سے شرمائے گی، گھبرائے گی
میری کمزور نظر تاب کہاں لائے گی!
تو اسی حلقۂ زنجیر کو دیکھ
جس کے بے رحم نشاں
میرے بیمار و حزیں جسم میں پیوستہ ہیں
میرے اجداد کا پیمانِ وفا
کہیں پیمانِ وفا ٹوٹا ہے
نقش پائندہ ہیں زنجیر تو کٹ سکتی ہے
ذہن آزاد نہیں
تین سو سال کی دیوار بھی ہٹ سکتی ہے

اعتذار

تم سمجھتی ہو یہ گلدان میں ہنستے ہوئے پھول
میری افسردگیٔ دل کو مٹا ہی دیں گے
یہ حسیں پھول کہ ہیں جانِ گلستانِ بہار
میرے سوئے ہوئے نغموں کو جگا ہی دیں گے

تم نے دیکھی ہیں دمکتی ہوئی شمعیں لیکن
تم نے دیکھے نہیں بجھتے ہوئے دیپک ہمدم!
وہی دیپک جو نگاہوں کا سہارا پا کر
ایک لمحے کے لیے جلتے ہیں ـــ بجھ جاتے ہیں

کبھی اک اشک سے دُھل جاتے ہیں صدیوں کے غبار
کائنات اور نکھر اور سنور جاتی ہے
کبھی ناکام تمنا کی صدائے مبہم
قہقہہ بن کے فضاؤں میں بکھر جاتی ہے

ٹوٹتے تاروں کے سنگیت سنے ہیں تم نے!
وہ بھی نغمے ہیں جو ہونٹوں سے گریزاں ہی رہے
پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھے ہیں فضاؤں میں کبھی
وہ فسانے جو نگاہوں سے بیاں ہو نہ سکے

کبھی کانٹوں سے بہل جاتی ہے روحِ غمگیں
اور معصوم شگوفوں کی رسیلی خوشبو
نیشتر بن کے رگِ جاں میں اتر جاتی ہے
ہاں یہی پھول — یہی جانِ گلستانِ بہار
ناگ بن کر کبھی احساس کو ڈس لیتے ہیں!

تنہائی

اجنبیت کے گرانبار دھندلکوں سے پرے
مَیں نے ڈھونڈیں تھیں وہ مانوس نگاہیں جن کو
نکہت و نور سے تعبیر کیا جاتا ہے!
نکہت و نور سے مدہوش فضاؤں کی قسم
آج تک مجھ کو وہ مانوس نگاہیں نہ ملیں
وہ نگاہیں جو نگاہوں کو سہارا دیتیں
شدّتِ یاس کی ویران گزرگاہوں میں

اجنبیت کا گرانبار الم ناک سکوت
اور بڑھتا رہا بڑھتا رہا بڑھتا ہی گیا
بزمِ مہتاب میں تاروں کے شبستانوں میں
میری ظلمت زدہ تنہائی مرے ساتھ رہی
نقرئی گیتوں کی خواب آفریں مدھم تانیں
دردبن بن کے کلیجے کو کھرچتی ہی رہیں
دور ہنستی ہوئی شمعوں کی لپکتی کرنیں
دل کے ویرانے کو ڈستی رہیں ڈستی ہی رہیں

اجنبیت کا گرانبار الم ناک سکوت
اور بڑھتا رہا، بڑھتا رہا، بڑھتا ہی گیا
ایک دھندلی سی کرن کی بھی نہیں ہے مرہون
مری ظلمت، مری تنہائی، مری خاموشی

یہ جیون یونہی بیتے گا

ان گنت سانسوں کی الجھی ہوئی زنجیروں میں
زندگی ہے کہ جکڑتی ہی چلی جاتی ہے
بجھ کے رہتی بھی نہیں اور بھڑکتی بھی نہیں
آگ سی ہے کہ سلگتی ہی چلی جاتی ہے

وقت کس جنّتِ موہوم کا لالچ دے کر
مجھ کو ماضی کے جزیروں سے اُٹھا لایا ہے
میں انہیں سیگوں کرنوں میں پروتی ہی رہی
میرے بکھرے ہوئے خوابوں کو چرا لایا ہے

ذہن پر جیسے ہوں بیتے ہوئے لمحوں کے نقوش
جیسے بھولی ہوئی یادیں کسی افسانے میں
اس طرح لا کے یہاں چھوڑ گیا ہے کوئی
جیسے بھٹکا ہوا راہی کسی ویرانے میں

چلتے چلتے انہیں آن جانی گزرگاہوں میں
دھیرے دھیرے کبھی وہ وقت بھی آجاتا ہے
کائنات ایک ہی آنسو میں سمٹ آتی ہے
زد پہ آندھی کی دیا کانپ رہا ہو جیسے
تھک کر افسردہ و ویران گزرگاہوں میں
آخری عہدِ وفا ہانپ رہا ہو جیسے

اور یہ آنسو کہ پلکوں سے ڈھلکتا بھی نہیں
ہائے یہ ساغرِ لبریز چھلکتا بھی نہیں

پرچھائیاں

زندگی۔ زندگی کا نام نہ لے
تیرگی تھی کہ نور شرمایا!

جس دریچے تک اٹھ گئیں نظریں
ایک ماتم کدہ نظر آیا

ولولے مضمحل، نگہ بے رس
مدّتوں موت نے بھی ترسایا

عزم افسردہ، روح آزردہ
ہر تدبّر پہ یخبت کا سایا

التجاؤں کا ذکر کیا کیجے
آرزوں نے خون تھکوایا

سانس لینے نہ پائی تھی کھل کر — دل میں پھانسیں کئی کھٹک اٹھیں
مجھے شمعوں کا جب خیال آیا — چند پرچھائیاں لپک اٹھیں
مسکراہٹ سی لب پہ آئی تھی — غم کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں
دور افق پر کرن سی چمکی تھی — دل کی پہنائیاں دھڑک اٹھیں

ہائے جلووں کی حشر سامانی
خود نگاہیں جھپک جھپک اٹھیں

اک طرف چارہ سازیٔ بیہم — اک طرف نازِ آبلہ پائی
اک طرف حسن کے سجود و نیاز — اک طرف عشق کی خود آرائی
راہ کے پیچ و خم، معاذ اللہ — پاؤں تھرّائے، عقل چکرائی
باگ طوفاں کی موڑ سکتی تھی — جانے کیا سوچ کر میں شرمائی

زندگی اتنی رائگاں تو نہ تھی
ہائے کس رہگزر میں بھول آئی

افق کے پار

افق کے پار ستاروں کی خوابگاہوں میں
فسوں بدوش نظارے بلا رہے ہیں مجھے

یہ زندگی، کہ شکستِ دوام کہیے جسے
طلسمِ بندگیٔ صبح و شام کہیے جسے
وفورِ یاس سے سہمی ہوئی، لجائی ہوئی
رخِ امید پہ یہ بیوگی سی چھائی ہوئی
یہ اختیار پہ رسم و رواج کے پہرے
نگاہِ شوخ پہ ظالم سماج کے پہرے

یہ احتیاج کے پھندے میں آرزو کا گلا
یہ مردہ ہاتھوں میں بے باک زندگی کا عصا
قدم قدم پہ سسکتی ہیں ان گنت لاشیں
کہ بک رہی ہیں سرِ راہ روح کی قاشیں
یہ رہگزر مرے پائے جنوں کو راس نہیں
یہ تیرگی مری تعمیر کی اساس نہیں

افق کے پار ستاروں کی خوابگاہوں میں
جہاں بہشت بھی جچتی نہیں نگاہوں میں
جہاں رواج کی زنجیرِ کہنہ گلتی ہے
جہاں یقین کے سانچے میں آہ ڈھلتی ہے
خود آگہی کے طریقے سکھائے جاتے ہیں
نگاہِ عجز کو نشتر تھمائے جاتے ہیں

جہاں سلگتے ہوئے کم نصیب اشکوں سے
چراغِ عشرتِ مغرور جل نہیں سکتے

وہیں لطیف بہار آفریں پناہوں میں
حیاتِ نو کے اشارے بلا رہے ہیں مجھے!

غزل

نازفرما ہے جراَتِ عصیاں — رائیگاں کیوں ہو رحمتِ یزداں

باہزاراں تلطفِ یزداں — کہیں بدلی ہے فطرتِ انساں

حسن رنگین و دیدۂ حیراں — زندگی اور اِس قدر ارزاں

مجھے ساحل پہ اعتماد مگر — ہے یہ توہینِ عظمتِ طوفاں

آپ کی سرگرانیوں کی قسم — ہوں رہینِ نوازشِ پنہاں

زلفِ برہم، نگاہِ ژولیدہ — کس فسانے کا بن گئے عنواں!

کیوں نگاہِ کرم ہے آزردہ — درد ہے اب بھی آرزو ساماں

زندگی مسکرا اٹھی ہے ادا

رائیگاں کیوں ہو زحمتِ مژگاں

میرے محبوب

تیرے نوخیز شگوفوں کی رسیلی خوشبو
آج بھی گیت کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
آج بھی تیری فضاؤں میں رچے ہیں نغمے
آج بھی ہوں تری محبوب بہاریں رقصاں
نکھری نکھری تری معصوم سلونی شامیں
ارغواں صبحیں رہیں آج بھی تاباں تاباں
ناز فرما ہو اسی نازِ خود آگاہی سے!
تیرے لہجے کی کھنک، تیری نگاہوں کی جھپک

مرے محبوب، مرے دوست، مرے خوابِ عزیز
نوجواں ہے مرا احساس جواں ہے جب تک

دیکھ تو تیرے لیے کتنی بہاریں تج کر
مَیں نے اپنایا ہے تپتے ہوئے ویرانوں کو
نوجوانی جنھیں دن رات بُنا کرتی ہے
مَیں نے تیرے لیے ان خوابوں کو جھٹلایا ہے
کتنے بپھرے ہوئے طوفانوں سے ٹکر لی ہے
کتنی بے خواب تمنّاؤں کو ٹھکرایا ہے
اپنے بے نور گھروندے سے چرا کر نظریں
قمقمے تیرے شبستاں میں جلا رکھے ہیں
اپنے پھولوں کو گنوا کر ترے انگاروں میں
تیرے کانٹے بھی کلیجے سے لگا رکھے ہیں

کتنے سجتے ہوئے، ہنستے ہوئے ارمانوں کو
چند دانوں کے عوض بیچ دیا ہے میں نے
چند دانے ترے پندار کی قیمت تو نہیں!
تو جواں ہے مرے محبوب، مرے خواب عزیز!
میرے دل میں ترا احساس جواں ہے جب تک
چشمِ نم خوابِ گرانبار کی قیمت تو نہیں
تو مرا عزم، مرا جذبۂ بے باک تو دیکھ!
دیکھ زنجیر پگھلتی ہے، گلی جاتی ہے!

غزل

فریب کاریٔ تخئیل پر جو اترائے
اب ایسے سرکش و ناداں کو کون سمجھائے

ہزار غنچوں نے چاہا الگ تھلگ رہنا
جو کوئی شوخ کرن آپ ہی اُلجھ جائے

گرہ کشائیٔ شبنم کی داد کیا دیں، گل
ہنسی کے ساتھ ہی آنکھوں میں اشک بھر آئے

نگاہِ قہر کی گرمی کی تاب کیا لاتے
نگاہِ مہر کی شوخی سے بھی جو کملائے

تری نگاہ کی حیرانیوں کے افسانے
مری نگاہ کی نادانیوں نے سمجھائے

تمہیں تو حسن کی ژولیدگی سے شکوہ تھا
ادا یہ کس نے نگاہوں کے راز سلجھائے

قافلے

قافلے آئے گئے

قافلے آئے نگاہوں نے بچھایا دامن
تیرہ و تار فضاؤں نے جلالیں شمعیں
آئینہ گردشِ ایّام کو دکھلانے لگے
وقت کے لب پہ نئے زمزمے اترانے لگے
رات کے اشکِ سیہ تاب کے ساغر ڈھلکے
ان کہے راز ستاروں کی نگہ سے چھلکے

نازکرتا ہُوا زر کار سجیلا آنچل
مسکراتا ہُوا مدہوش رسیلا کاجل
داستانیں ہوئیں تصنیف بہ عنوانِ وفا
لیلیٰ شوق سے باندھے گئے پیمانِ وفا
زندگی مچلی امنگوں کا اشارا پاکر
جاگ اٹھی پھوٹتی کرنوں کا سہارا پاکر
آگ سی لگ گئی سینے میں کھتاوں کے
زمزمے گونج اٹھے مست حدی خوانوں کے

قافلے آئے۔ گئے

قافلے گزرے، نگاہوں نے سمیٹا دامن
تھرتھرائے ہوئے لمحوں نے بجھا دیں شمعیں

کیف بر دوش فضاؤں پہ اندھیرے لپکے
بھوت بن بن کے خلاؤں میں بگولے لپکے
راز داں تاروں کی معصوم نگاہی بھی نہیں
ظلمتِ دشت میں بھٹکا ہُوا راہی بھی نہیں
بے وفا راہوں میں پیمانِ سفر کھو بھی چکا
وقت کے ہاتھ میں یادوں کا دیا بھی نہ رہا
ریت کے ماتھے پہ نقشِ کفِ پا بھی نہ رہا

ریت کے ماتھے پہ نقشِ کفِ پا بھی نہ سہی
وقت کے ہاتھ میں یادوں کا دیا بھی نہ سہی
حوصلے اور نئی شمعیں جلائیں گے ابھی
نئے راہی، نئی منزل، نیا سامانِ سفر

نئے پیمان، نئے عزم، نئی شانِ سفر
ظلم پروردہ تمنّاؤں کی شہ پائے ہوئے
سر اٹھائے ہوئے، بپھرے ہوئے، اترائے ہوئے
زخم کھائے ہوئے، کچلے ہوئے، ٹھکرائے ہوئے
یعنی ہر گام پہ منزل کی قسم کھائے ہوئے
قافلے اور اسی راہ سے آئیں گے ابھی!

اک ذرا صبر....

ہاں روحِ کائنات کو رقصاں کریں گے ہم

ہاں اہتمامِ جشنِ بہاراں کریں گے ہم

سامانِ صد ہزار گلستاں کریں گے ہم

تیغِ نگاہِ ناز کو عُریاں کریں گے ہم

ظلماتِ بے پناہ سے تنگ آچکا ہے دل

شمعِ حیاتِ تازہ فروزاں کریں گے ہم

لیلائے کائنات کے گیسو سنوار لیں!

زلفِ جنوں کو سلسلہ جنباں کریں گے ہم

یہ تیرگیٔ صبر شکن چھٹ تو لے ذرا
ذرّوں کو روکشِ مہِ تاباں کریں گے ہم
اک گام اور ــــ بڑھ کے قدم لیں گی منزلیں
آسودگانِ رہ کو پشیماں کریں گے ہم
اک بار اور شدّتِ طوفاں سے دارو گیر
پھر آرزوئے گوشۂ داماں کریں گے ہم
توپوں کی گھن گرج سے نبٹنے تو دیجیے
پیماں شکن سے حجتِ پیماں کریں گے ہم
اک بار اور کفر پہ احساں کریں گے ہم
اک بار اور بیعتِ قرآں کریں گے ہم

شکریہ

ہاں آپ کی نوازشِ پیہم کا شکریہ !

(افسانۂ بہار بھی کہیے تو کیا غضب)

مانا کہ جبرِ زیست سے تنگ آگیا ہے دل

تاریکیٔ دوام سے اکتا گیا ہے دل

ہاں روحِ کائنات ہے زخموں سے چور چور

کب تک تلاشِ چارہ گرِ قلبِ ناصبور

میٹھے سروں میں گیت کوئی گنگنائیے !

محبوبۂ نشاط سے اب لو لگائیے

لیتے ہیں دادِ نغمہ گرانِ اجل سے ہم
محرومیٔ ازل کے ہیں خوگر ازل سے ہم
منزل اگر ہے دور تو کیا — سنگِ در تو ہے

تعبیرِ تلخ تر سے عبث سرگراں ہیں آپ
کیوں خوابِ دلپذیر سے دامن کشاں ہیں آپ؟
لے آب و رنگ نقش نگاہوں پہ بار ہیں
اپنے ہی خد و خال سہی، ناگوار ہیں
(اب کچھ دنوں خموش بھی رہیے، تو کیا غضب)
حُسنِ بیانِ گیسوئے برہم کا شکریہ!

غزل

یہ کس کی راہگزر میں دیئے جلائے ہیں
یہ کیوں مژہ یہ ستارے سے جھلملائے ہیں
بجھا بجھا کے چراغِ وفا جلائے ہیں
خطا معاف، سمجھ کر فریب کھائے ہیں
ادا ادا نے چلائے ہیں بے دھڑک نشتر
سنبھل سنبھل کے نگاہوں نے زخم کھائے ہیں
جنہیں نصیب تری کم نگاہیاں بھی نہیں
وہ کم نصیب ابھی آسرا لگائے ہیں

فریبِ ہوش کی دیوانہ سازیاں توبہ
بقدرِ حدِ جنوں حوصلے بڑھائے ہیں
بھٹک بھٹک کے پہنچ ہی رہیں گے منزل تک
نشانِ راہ سے بچ کر قدم اٹھائے ہیں
وہ اور ہوں گے کنارے سے دیکھنے والے
مری نہ پوچھ کہ طوفاں کے ناز اٹھائے ہیں
خدا نکردہ کچھ احسانِ برق و باد نہیں
ہم آرزوئے نشیمن پہ مسکرائے ہیں
بہار ریز افق پر دھواں کیسا
چمن کی خیر! یہ کس آرزو کے سائے ہیں
فروغِ حسنِ نظر دیکھ کر رہا نہ گیا
کہاں پہنچ کے ادا پاؤں لڑکھڑائے ہیں

میں ساز ڈھونڈتی رہی

بہار کھلکھلا اُٹھی

جنوں نواز بدلیوں کی چھاؤں میں

جنوں نواز بدلیوں کی چھاؤں میں بہار کھلکھلا اٹھی

ہر ایک شاخِ لالہ زار سجدہ ریز ہو گئی

ہر ایک سجدہ ریز شاخسار پر طیور چہچہا اٹھے

ہوائے مرغزار گنگنا اُٹھی

فضائے نو بہار لہلہا اُٹھی

ہوائے نوبہار میں، فضائے مرغزار میں حیات مسکرا اٹھی

جنوں نوازیاں بڑھیں

فسانہ سازیاں بڑھیں

ادائے نازکی کچھ اور بے نیازیاں بڑھیں

کچھ اس ادائے ناز سے بہار کھلکھلا اٹھی

جنوں نواز اودی اودی بدلیوں کی چھاؤں میں!

مگر بہار کو ابھی تک آرزوئے نغمہ تھی

شہیدِ کیفِ انتظار و جستجوئے نغمہ تھی

میں ساز ڈھونڈنے لگی

نوائے شوخ و مست و دلنواز ڈھونڈنے لگی

بصد غرور و افتخار و ناز ڈھونڈنے لگی

مَیں ساز ڈھونڈتی رہی
بہار کی فضاؤں میں
جنوں نواز بدلیوں کی بھینی بھینی چھاؤں میں
مَیں محوِ جستجو رہی
مگر یہ میری بھُول تھی
حیات اپنی رس بھری کہانیاں سنا چکی
ہوائے مرغزار لوریاں سنا کے جا چکی
فضائے نو بہار جامِ ارغواں لنڈھا چکی
بہار کی نشیلی انکھڑیوں میں نیند آ چکی
مگر مَیں ڈھونڈتی رہی
مجھے وہ سازِ دلنواز آج تک نہ مل سکا
وہ اودی اودی بدلیاں کہ فخرِ صد بہار تھیں

فلک کی چشمِ خوں فشاں سے اشک بن کے ڈھل گئیں
دکھائی دے رہی ہے کائنات کچھ لُٹی لُٹی
دھوئیں کی بو سے ہے فضا کی سانس بھی گھٹی گھٹی
زمیں پہ شعلہ باریاں، فلک پہ گڑگڑاہٹیں
کہ سن رہے ہیں چشم و دل نظامِ نو کی آہٹیں
بہار بیت ہی چکی خزاں بھی بیت جائے گی
مگر میں ایک سوچ میں پڑی ہوئی ہوں آج بھی
وہ میری آرزو کی ناؤ کھے سکے گا یا نہیں
نظامِ نو بھی مجھ کو ساز دے سکے گا یا نہیں !؟

غزل

رہ گئی شرمِ ناشکیبائی
بھولنے والے تیری یاد آئی

اللہ اللہ نازفرمائی
آنکھ جھپکی تھی زلف لہرائی

اس طرف چارہ سازیٔ پیہم
اس طرف نازِ آبلہ پائی

وہ بھی آزردۂ نگاہ رہے
دل ہی تنہا نہ تھا تماشائی

زندگی تھی کہ کاکلِ برہم
آپ سلجھائی، آپ الجھائی

منزلیں بڑھ کے خود قدم لیتیں
میں ہی آغازِ رم نہ کر پائی

میں نے اک گیت گنگنایا تھا
بڑھ گیا اور رنجِ تنہائی

بھولنے والے بھول کر خوش تھے
یاد آئی تو بار بار آئی

التجا اتنی بے اثر تو نہ تھی
ہائے پندارِ ناپذیرائی

بارہا ہم نے پی لیے آنسو
بارہا آپ کو ہنسی آئی

دل کا انداز شرمسار ادا
نگہہ ناز بھی تو پچھتائی

سہارا

اِدھر دیکھ یہ ریشمیں، مرمریں، نرم باہیں
یہ کلیوں کے گجرے، یہ حسنِ شبستاں
لچیلی، رسیلی، حسیں مسکراتی ہوئی شوخ کلیوں کے گجرے
یہ حسنِ فروغِ جمالِ شبستاں
یہ مرکز تری آرزوئے جواں کا
یہ حاصل تری زحمتِ جاوداں کا
تری سینہ کوبیِ پیہم کا، دردِ نہاں کا
یہ قوسِ قزح کی چرائی ہوئی شوخ رنگت
یہ پھولوں کی نرمی، یہ کلیوں کی نزہت

ستاروں کی شوخی، بہاروں کی فطرت
یہ جاتی ہوئی کہکشاں کو سبک گام راہیں
یہ بے چین ہیں امتحاں کو
یہی ریشمیں نرم باہیں
فروغِ شبستاں سے اب پھیر بھی لے نگاہیں
یہ مانا کہ چشمِ فلک نے نہ اب تک جھلک دیکھ پائی
مبادا اپڑے بال اِن آئنوں میں
نہ زخمِ نگہہ آنے پاتے!
مگر اب ذرا آزما اِن کی ہمّت
یہ مدّت سے بے چین ہیں امتحاں کو
تری تیرہ بختی، تری بے نوائی
ترے اشکِ پیہم، تری آہ سوزاں

ترے درد کا اب بھی ممکن ہے درماں

تجھے جس سہارے کی ہے جستجو مدّتوں سے

زفیضِ تمنّا ابھی مل بھی جائے

بہت ہے کہ اب تک جواں ہیں ارادے

ذرا حوصلے دیکھ ان کے!

یہی ریشمیں، مخملیں، مرمریں، نرم باہیں

جو چاہیں

اٹھا کر ٹپک دیں زمین و زماں کو

ترے آسماں کو

ترے آسمانوں کے رازِ نہاں کو

یہ حسنِ فروغِ جمالِ شبستاں

غزل

جو اک نگاہِ فسوں کار پر گیا ہو گا
تری نگاہ کے قرباں! کدھر گیا ہو گا

یہ اجڑا اجڑا چمن، یہ لٹا لٹا سا سنگار
تمہیں کہو کسے برباد کر گیا ہو گا

مرا چراغ مری تیرگی مٹا نہ سکے!
تمہارے گھر میں اجالا تو کر گیا ہو گا

اجڑنے والوں سے ویرانیوں کا حال نہ پوچھ
غرورِ حسن تماشا سنور گیا ہو گا

ہزار بار سنوارا جسے نگاہوں نے
ہزار بار وہ نغمہ بکھر گیا ہو گا

تو میرے شوق کی حیران نگاہیوں پہ نہ جا
وہ باخبر ہے جو یوں بے خبر گیا ہو گا

اترنے والے بھلا پار کیا اتر سکتے
نگاہِ ناز کا احسان دھر گیا ہو گا

جو اک نگاہِ خرد آزما پہ مر نہ مٹا
وہ جینے والا بڑا نام کر گیا ہو گا

شعورِ ناز کا الزامِ دلفریب آدا
نہ جانے کس کی تمنا کے سر گیا ہو گا

نقرئی دھندلکے

ڈھلکے ڈھلکے آنسو ڈھلکے

چھلکے چھلکے ساغر چھلکے

دل کے تقاضے ان کے اشارے

بوجھل بوجھل ہلکے ہلکے

دیکھو دیکھو دامن اُلجھا

ٹھہرو ٹھہرو ساغر چھلکے

ان کا تغافل، ان کی توجہ

اک دل اس پر لاکھ تہلکے

ان کی تمنا، ان کی محبت

دیکھو سنبھل کے، دیکھو سنبھل کے

غم نے اٹھائے سیکڑوں طوفاں
دل نے اٹھائے لاکھ محلکے

پل میں ہنساؤ، پل میں رلاؤ!
پل میں اجالے، پل میں دھندلکے

ہم نے نہ سمجھا، تم نے نہ جانا
دل نے مچائے لاکھ تہلکے

لاکھ منایا، لاکھ بھلایا
نین کٹورے بھر بھر چھلکے

کتنے الجھے، کتنے سیدھے
رستے ان کے رنگ محل کے

کڑیاں جھیلیں، پاپڑ بیلے
جھلکے اب تو مکھڑا جھلکے

دو نین کمل

دو نین کمل

گھونگٹ میں گھنیری رات لیے

آنچل میں بھری برسات لیے

کچھ پائے ہوئے، کچھ کھوئے بھی

کچھ جاگے بھی، کچھ سوئے بھی

چینچل اوشا کے بان لیے

گھمبیر گھٹا کا مان لیے

ساون کے سجل سنگیت بھرے

کچھ ہار بھرے کچھ جیت بھرے
کچھ بیتے دنوں کی کروٹ سی
کچھ آتے دنوں کی آہٹ سی
کن گلیوں دیپ جلائے سکھی
یہ بھونرے کت منڈلائے سکھی

سپنوں سے بوجھل بوجھل

دو نین کمل!

کچھ گھبرائے، کچھ شرمائے
کچھ شرما شرما اترائے
سکھی! بھیدی بھید نہ پا جائے
کچھ الجھی سلجھی آشائیں
کچھ بوجھی بوجھی بھاشائیں

کچھ بکھرے بجھرے راگ لیے
کچھ میٹھی میٹھی آگ لیے
انوراگ لیے بیراگ لیے
متوالے من کو روگ دیا
سکھی! کس برہن نے جوگ لیا

نینوں سے اوجھل اوجھل
دو نین کمل!

شگوفے

یہ بہاروں کے سجیلے سپنے
یہ شگوفے، یہ لجیلے سپنے

مسکرائے تو حیا لوٹ پڑی
کسمسائے تو ادا پھوٹ پڑی
ان کے مکھڑے کی جنوں خیز تپک
ان کے لہجے کی فسوں ساز کھنک
ان کی معصوم نگاہوں کی جھجک
یہ نزاکت، یہ لگاوٹ، یہ پھبن
یہ نہائے ہوئے شبنم میں بدن

آج سے پہلے نہ پہچان سکی
آج سے پہلے نہ کیوں جان سکی

آج سے پہلے بھی پھوٹے ہونگے
یہ شگوفے، یہ لجیلے سپنے
یہ بہاروں کے سجیلے سپنے
اسی شوخی، اسی رعنائی سے
یہی لہجہ، یہی لہجے کی کھنک
یہ سجاوٹ، یہ سجاوٹ کی جھمک
یہ نگاہیں، یہ نگاہوں کی جھجک
اسی معصومی و برنائی سے

شکوہ بیگانہ نگاہی کا لیے
شاخ میں پہلے بھی پھوٹے ہونگے
یہ شگوفے، یہ لجیلے سپنے

غزل

تری نگاہ سے روشن رہیں دلوں کے شرار
سرودِ نے پہ نہیں نغمۂ حرم کا مدار

یہ اور بات، نظر ہو نہ محرمِ اسرار
مجالِ رم، نہیں پابندِ گردشِ ادوار

اسیر رکھ نہ سکے انجم و قمر کے حصار
تمہیں ملال مجھے نازِ جرأتِ انکار

مجھے حیات کی ویرانیوں کا دھیان مگر
مری نگاہ پہ ہے فرضِ احترامِ بہار

غمِ حیات کے زخموں کا احتساب نہ کر
یہ میٹھی میٹھی نگاہوں کی بھینی بھینی پھوار

پیامِ زندگیٔ نو نہ بن سکیں صد حیف
یہ اودی اودی گھٹائیں، یہ بھیگی بھیگی بہار

خطا معاف، سنبھالے نہیں سنبھلتا دل
یہ التفاتِ گریزاں کہ ہے جنوں آثار

مجھے جمال سے بڑھ کر ہے اعتبارِ نگاہ
ترے خیال سے اب تک نہ کر سکی اصرار

مرے مذاقِ مقامِ آشنا کی داد تو دے
تو اوجِ ماہ سے اونچا، میں خاکِ راہگزار

تو میرے عزم کی پہنائیاں نہ بھانپ سکا
میں دیکھ بھال چکی تیرے ثابت و سیّار

مجھے نگاہِ خرد آشنا سے شکوہ ہے
کہ ہو سکی نہ شعورِ نگاہ سے دوچار

سنے تو ہوں گے مرے نغمہ ہائے شوریدہ
ترا کمالِ ترنّم، مرا نصیب پکار!

غزل

جل رہا ہے گلستاں   چھوڑ ذکرِ آشیاں
لُٹ رہا ہے کارواں   سر جھکا سنگِ نشاں
زندگی سے سرگراں   زندگی کے رازداں
آگیا ذکرِ فغاں!   کٹ گئی یوں داستاں
حاصلِ آہ و فغاں   اِک نگاہِ بدگماں
ایک آنسو اک نگاہ   داستاں در داستاں
ہنس رہی تھی آرزو   جل رہا تھا آشیاں
حسن کی بھیگی لٹیں   کب نہ تھیں شعلہ بجاں

ان کے آنے تک ادا
ختم تھی ہر داستاں!